بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد اسلام علوی

رمضان، قرآن اور پاکستان

ایک مہمان کی آمد آمد ہے۔ کیسی کیسی ہستیاں چشم براہ ہیں۔ استقبال و پذیرائی کا یہ اہتمام اللہ! اللہ! فضاؤں کی عطر بیزیاں، ہواؤں کی تبسم ریزیاں، چہروں کی شگفتگی، نگاہوں کی چمک، سینوں کی وسعت اور جبینوں کی کشادگی سب آنے والے مہمان کی عظمت و شان کا پتہ دے رہی ہیں۔ مسرتیں جھوم رہی ہیں۔ فرحتیں اچھل رہی ہیں۔ ہر سو انبساط اپنی بساط بچھا رہی ہے۔ دلوں میں امنگیں کروٹ لے رہی ہیں۔ ترنگیں مچل رہی ہیں۔ تیاریاں بتا رہی ہیں کہ آنے والا کس شان کا ہے۔ ؎

کلیاں چٹک رہی ہیں فضا گا رہی ہے گیت
صحن چمن میں کون محو خرام ہے

سب گوش برآواز ہیں سب چشم براہ کیوں نہ ہوں؟ مہمان ہے جو ایسا ذیشان۔ ؎

اے باد صبا کچھ تو نے سنا مہمان جو آنے والے ہیں
کلیاں نہ بچھانا راہوں میں ہم آنکھیں بچھانے والے ہیں

بعض اوقات مہمان کی عزت و شان میزبان کی نسبت سے اجاگر ہوتی ہے۔ مہمان اپنے میزبان کے حوالے سے اپنا قد کاٹھ بڑھانا چاہتا ہے۔ او جی! میرا فلاں کے ہاں آنا جانا ہے۔ میں کئی بار فلاں کے گھر مہمان ہوا ہوں۔ بعض اوقات مہمان کی نسبت سے میزبان کا وقار دوبالا اور چہار بالا ہو جاتا ہے، وہ بصد افتخار ہر ایک کے سامنے اظہار کرتا پھرتا ہے کہ فلاں صاحب میرے بطور مہمان آئے۔ فلاں کا میرے ہاں آنا جانا ہے۔ وہ کئی بار ہمیں شرف میزبانی بخش چکے ہیں۔ رودکی نے امیر نصر بادغیس کی بخارا آمد پر کہا تھا ؎

اے بخارا شاد باش و شادزی
شاہ سویت مہماں آید ہمی

اور ایک مرتبہ صدر ایوب خان کی پشاور آمد پر ایک شاعر نے رودکی کے رنگ میں غزل لکھی اور کہا۔ ؎

اے پشاور شاد باش و شادزی
سوئے تو ایوب خان آید ہمی

تقریباً ہر زبان میں اس قسم کے ضرب الامثال اور محاورات ہیں جن میں کسی کا بطور مہمان کسی کے ہاں بتسلسل آنا جانا محمود سمجھا گیا ہے۔ مثلاً مہمان عزیز است مگر تا سہ روز، (فارسی) قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا'' (اردو)، Every day's guest is never wel comed. (انگریزی)، زرغباً

تزدد حباً (عربی) وجہ یہ ہے کہ اس مطلبی دنیا میں عموماً کم ہی کوئی کسی غرض و حاجت کے بغیر کسی کے ہاں مہمان ہوتا ہے۔ کوئی قرض مانگنے آجاتا ہے کوئی فصل کٹائی کا حشرہ بننے کی دعوت دینے' اور کچھ نہیں تو یہ بڑے بڑے چغادری ووٹ مانگنے چلے آتے ہیں۔ برسوں ماقبل کے مرحومین کی تعزیت کرنی بھی انہیں یاد آجاتی ہے۔ ان سے تعلقداری بھی جتلاتے پھرتے ہیں لیکن کیا شان ہے اس مہمان کی جو آئے تو کچھ لینے کے لئے نہیں کچھ دینے کے لئے' کچھ مانگنے کے لئے نہیں کچھ بخشنے کے لئے' جو پریشان کرنے کے لئے نہیں نوازنے کے لئے تشریف لائے۔ کون ایسا ہوگا جو ایسے مہمان کی آمد سے خوش نہیں ہو گا؟ کون نہیں چاہے گا کہ ایسا مہمان روز روز آئے' جم جم آئے' سدا سدا آئے' بار بار آئے۔ کیونکہ وہ جس کو شرف میزبانی بخشتا ہے۔ اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اس کے نوافل کا ثواب فرائض کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کے ہر فرض کی ادائیگی کا اجر ستا گنا بڑھ جاتا ہے۔ اس کے منہ کی بو خالق کائنات کو مشک و کستوری سے بھی زیادہ بھاتی ہے۔ اس مہمان کی آمد کی آمد کے ساتھ ہی رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ابلیس و شیاطین جکڑے جاتے ہیں۔ اس کا میزبان اپنی ذات پر ایک روپیہ خرچ کرے تو اسے اللہ کی راہ میں ستر روپے صدقہ کرنے کا اجر ملتا ہے۔ پھر اس مہمان کی موجودگی آڈٹ اور محاسبے کو بھی سہل بنا دیتی ہے۔ ایسے مہمان کی میزبانی کا موقع پا کر بھی کوئی اپنے لئے جنت حاصل نہ کر سکے تو اسکی تیرہ بختی اور بدنصیبی میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اس بات کی خبر اس مخبر صادق نے دی جس کے بدترین دشمن بھی آپؐ ہی کے فرمان کے مطابق اگر لوگوں کو اس مہمان کی قدر معلوم ہو' اس کی عنایات و عطایا کا علم ہو تو وہ چاہیں کہ یہ ہمیشہ ہی ہمارے ہاں براجمان رہے تمام اس کی موجدگی سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہیں۔ وہی مہمان جو اللہ کے نیک بندوں کے ہاں اکثر ہم مجلس رہتا ہے۔ تمام انبیاء کے امتی' اولیاء' علماء' صحابہ' انبیاء اور خود امام الانبیاء ختم المرسلین ﷺ تو بطور خاص اس کو شرف میزبانی بخشتے رہے دوسروں کو بھی اس کی قدردانی کی تلقین فرماتے رہے۔ یہی مہمان رونق افروز تھا کہ انسانیت کے لئے ایک کامل و اکمل' غیر متبدل' جامع' آخری و ابدی ضابطۂ حیات و کتاب ہدایت جو دنیا و آخرت کی کامیابیوں و سرفرازیوں کی ضامن ہے رب ذوالجلال کی طرف سے نازل فرمائی گئی۔ ہاں' یہ اس موقع پر بھی جلوہ فگن تھا جب میدان بدر میں حق کو باطل پر پہلی فتح مبین نصیب ہوئی۔ اسی مہمان کی جلوہ افروزی کے دوران شہر مکہ میں حق کو باطل پر مکمل غلبہ حاصل ہوا۔ باطل سرنگوں ہوا' جاء الحق و زھق الباطل (17/81) کی صدائیں گونجیں۔ اسلام کا بول بالا ہوا' کفر کا منہ کالا ہوا۔ بتوں کو اوندھے منہ گرا دیا گیا۔ اللہ کا گھر صرف اللہ کی عبادت کے لئے مخصوص ہو گیا جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔ ہاں ہاں یہی تو ہے کہ جونہی اس نے چنستان ارضی میں قدم رکھا جنت کے تمام دروازے کھل گئے' جہنم کے سب دروازے بند ہو گئے۔ جنت کوئی دروازہ بند نہ رہا دوزخ کا کوئی دروازہ نہ رہ گیا۔ عام طور پر کسی کی خوش و شادمانی کے اظہار کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اس کا ہر روز روز عید اور اس کی ہر شب شبِ برات ہے۔ لیکن جہاں مومنوں کا یہ محبوب مہمان

تشریف فرما ہو وہاں کے شب و روز کی مسرتوں اور لطف و سرور کا احاطہ کرنے سے یہ تشبیہ و تمثیل قاصر ہے۔ اور پھر اس کے ہوتے ہوئے ایک رات ایسی بھی آتی ہے کہ اجر و خیر کے لحاظ سے وہ ہزار مہینوں سے برتر و فزوں تر ہے۔ اسی مہمان کی آمد پر اللہ کی جانب سے منادی صدائے عام لگاتا ہے۔ ''اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی ء کے شائق رک جا''۔ یہ مہمان تمام مہینوں کا سردار جو ہوا۔ اس کی آمد پر مومنوں کی روزی میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ہاں ہاں مومنوں کی روزی میں' جہاں میزبانی کا فریضہ سرانجام دینے والے دولت ایمان سے سرشار ہوں۔ وگرنہ۔ ع ببین تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا؟ جہاں میزبان حلقۂ مومنان ہو وہاں تو اس کی آمد کے ساتھ ہی رحمت کی برساتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ درمیان میں پہنچ کر مغفرت و بخشش کی سوغاتیں نچھاور ہونے لگتی ہیں اور آخری دنوں میں اس کے میزبانوں کو نار جہنم سے نجاتیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ ہاں ہاں وہی مہمان جس کی میزبانی کے شرف سے آپ خوش بخت اور بہرہ مند' شادکام و خورسند اور غفلتوں اور بے اعتدالیوں سے دامن ربائی کر کے احکام الٰہی کے پابند ہونے والے ہیں۔ ماہ رمضان

چمن ہنس پڑا راستے مسکرائے
بڑا شکریہ آپ تشریف لائے

نزول قرآن' فتح بدر اور فتح مکہ کے علاوہ اس بات کی قدردانی بھی ہم پر فرض ہے کہ اسی ماہ رمضان میں لیلۃ القدر کو جمعہ کہ روز ریاست مدینہ کے بعد ہمارا پیارا وطن پاکستان دنیا کی دوسری اسلامی ریاست کے طور پر وجود میں آیا اور مسلمانوں کو فرنگ و ہنود سے نجات حاصل کر کے دنیا میں قرآن کریم کا عادلانہ نظام نافذ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس لحاظ سے رمضان' قرآن اور پاکستان کا آپس میں ایک گہرا رشتہ اور تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ قرآن مسجد و خانقاہ ہی میں نہیں' منڈی' بازار' تھانہ' کچہری' سکول کالج' اسمبلی ایوان میں بھی نافذ ہونے کے لئے آیا ہے۔ ہر سال ماہ رمضان ہمیں اللہ سے کیا ہوا وہ وعدہ یاد دلاتا ہے جو ہم نے پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ۔ کے نعرے کی صورت میں اللہ سے کیا تھا۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ہم محلّہ' گاؤں کی سطح سے لے کر صوبے اور ملک کی سطح تک جو چھوٹے بڑے الٰہ بنے بیٹھے ہیں ان سے نجات حاصل کر کے خدائے واحد کا دیا ہوا نظام نافذ نہیں کر سکے۔ جس کے بغیر پاکستان کا جواز تخلیق ہی کچھ نہیں رہتا۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر وہ وعدہ یاد دلانے کے لئے ماہ رمضان آ رہا ہے۔ ؎

نظر آیا ہلال نو مبارک وقت شام آیا
جہاں میں نور پھیلاتا ہوا ماہ صیام آیا
خدارا اے مسلماں روزہ رکھ اور مردِ غازی بن
غنیمت ہے میسر تجھ کو پھر ماہ صیام آیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اس سے پہلے ملک میں علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات (21 اپریل) کی تقریب منائی جاتی تھی اب کچھ عرصہ سے اسے (نہ معلوم کن وجوہات کی بناء پر) ان کے یومِ پیدائش (9 نومبر) سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں کہ وہ تقریب ان کے یوم پیدائش کی نسبت سے منائی جاتی ہے یا یومِ وفات کی نسبت سے۔ ان تقاریب سے مقصد متعلقہ شخصیت کے ان احسانات کی یاد تازہ کرانا ہوتا ہے جن کے زیر بار اس کی قوم ہوتی ہے' اور ہر قوم کی طرف سے اظہارِ تشکر جسے اس کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کے' امت مسلمہ پر بالعموم' اور ملتِ پاکستانیہ پر بالخصوص احسانات کا تعلق ہے' وہ اس قدر کثیر' وقیع اور گراں بہا ہیں کہ ان کی سپاس گذاری سے کما حقہٗ عہدہ برا ہونا مشکل ہے۔ ایک مفکر کے پیغام کی عظمت اور اس کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے قوم کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا اور کس قدر انقلاب پیدا کیا۔ اس پیمانے سے ماپئے تو' دور دور تک نگاہ دوڑانے سے بھی اقبالؒ کا ہمسر نہیں ملتا۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے مصلحین (ریفارمرز) اور بھی کئی نظر آئیں گے لیکن ان کی نگاہ یا دسترس شجرِ اسلام کی شاخ تراشی تک محدود رہی۔ یہ اقبالؒ تھا جس کی دوررس اور ژرف بین نگاہ اس کی اصل و بنیاد تک پہنچی۔ اس نے کہا کہ سوال اِس خرابی یا اُس خرابی کا نہیں۔ ہمارا مروجہ اسلام' سرے سے حقیقی اسلام ہے ہی نہیں۔ یہ وہ سکہ ہے جو ہمارے دور ملوکیت کے ٹکسالوں میں ڈھلا اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے صرافہ میں جس کا چلن ہے۔ جب تک اس اسلام کو حقیقی اسلام سے بدلا نہیں جائے گا' شجرِ ملت کی کوئی شاخ نہ سرسبز و شاداب ہو گی نہ بارآور۔ یہ اسلام' قرآن مجید کے دفتین میں محفوظ (اور اب ملفوف) ہے۔ بنابریں اس نے ملت اسلامیہ سے کہا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یعنی اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تو قرآن کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ آسان کام نہیں۔ اسلام کو مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے چھڑانے کا فریضہ وہی شخص سرانجام دے سکے گا جو' جرأت و بسالتِ فاروقؓ کے ساتھ اس انقلاب آفریں نعرہ کو لے کر اٹھے کہ۔۔ حسبنا کتاب اللہ۔۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

پھر اقبالؒ ان مفکرین میں سے نہیں تھا جن کا نام محض نظریات بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسے عملاً متشکل کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ اس نے (1930ء کے خطبۂ صدارت میں کہا کہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں مروجہ اسلام مملکتی حیثیت سے پہلے سے رائج نہ ہو۔ وہاں صدرِ اول کے سے قرآنی اسلام کو عملاً نافذ کیا جا سکے گا۔

یہ ہیں اس شمعِ بصیرتِ قرآنی کی ضوفشانیوں کے چند مختصر سے گوشے جو اس حکیمِ انقلاب نے شبستانِ ملت میں روشن کی۔ یہ مایوس اور شکست خوردہ قوم اس بانگِ رحیل سے ایک نیا ذوقِ سفر لے کر اٹھی اور نشاۃ ثانیہ کی امنگیں اور عزائم سینے میں لئے آزادی اور استقلال کی حقیقی منزل پر جادہ پیما ہوگئی۔ اس کی منزل اقوامِ عالم میں سب سے انوکھی منزل تھی اور اس کا ذوقِ سفر امتیازی خصوصیت کا حامل۔ چند سالوں میں یہ کاروانِ شوق اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ منزل آخری منزل نہیں تھی۔ منتہیٰ و مقصود ایک خطۂ زمین کا حصول نہیں تھا' بلکہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں مقصود یہ تھا کہ

> وہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمد ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

''نورِ توحید کا یہ اتمام'' ابھی باقی ہے اور جب تک یہ ممکن نہ ہوا اقبالؒ کی روح مطمئن اور مسرور نہیں ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضیاءاللہ۔ گوجرہ

اقبالؒ کا ''عِشق''

فکرِ اقبال کی ایک نمایاں اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؒ نے عام تشبیہات و استعارات و تلمیحات اور علامات و اشارات وغیرہ کا انتخاب کر کے ان کو اپنے نادر مفاہیم اور جداگانہ معانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال ''خودی'' کی اصطلاح ہے۔ اقبالؒ سے پہلے خودی کا لفظ تمدن و معاشرت اور ادبیات میں کچھ اچھا تاثر پیدا نہیں کرتا تھا۔ اسے غرور و تکبر' انانیت اور سرکشی کے پیرائے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن حضرتِ اقبال نے اپنے کلام میں خودی کو جو معانی عطا کئے اس نے خودی کے دیرینہ مفاہیم کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اب خودی کی اصطلاح انسان کے جوہرِ ذات اور اس کی نمود کے مفہوم میں استعمال ہونے لگی۔

خودی ہی پر کیا موقوف' آپ ''شاہین'' کو لیجئے' ایک عام سا گوشت خور پرندہ تھا لیکن اقبالؒ کی شوخئ نظارہ نے اس کو کیا سے کیا بنا دیا۔ حتیٰ کہ یہ ہماری فضائیہ کا سرمایۂ افتخار بن گیا۔ پھر ''گلِ لالہ'' پر اقبالؒ کی نگاہِ التفات پڑی تو اسے ''جذبۂ پیدائی'' اور ''لذتِ یکتائی'' کی علامت بنا کر رکھ دیا۔ بعینہٖ یہی معاملہ اقبالؒ نے عشق سے بھی کیا۔ اقبالؒ سے پہلے عشق حجرۂ صوفی میں مقید تھا اور عجیب و غریب توہمات و خرافات کا شکار تھا' اقبالؒ نے اسے زاویۂ خانقاہی سے نکال کر رسمِ شبیریؓ کی ادائیگی پر آمادہ کر لیا۔ یہ عشق جو ادیبوں اور شاعروں کے ہاں محض دیوانگی' ازخود رفتگی' جنون اور دماغی خلل سے عبارت تھا' اقبالؒ کے حلقۂ سخن میں وارد ہوا تو وہاں تک جا پہنچا جہاں دانش و دین و علم و فن اس کے حضور دست بستہ نظر آئے۔ عقل اس کے مقابل آئی تو حیلہ جو اور بہانہ ساز ٹھہری۔ اس عشق کو اپنے قدیم مفاہیم سے کچھ علاقہ نہ رہا' اقبالؒ نے اس کو نیا پیرایۂ سخن عطا کر دیا۔

اقبالؒ کا عشق کیا ہے؟ نہ تو یہ دیوانگی ہے' نہ ازخود رفتگی ہے' نہ اسے لیلیٰ سے کچھ علاقہ ہے نہ مجنوں سے سروکار۔ اسے ''صوفیوں'' کے ''چنڈو خانوں'' سے بھی کچھ غرض نہیں۔ اقبالؒ کا عشق دراصل اس جذبۂ عمل سے عبارت ہے جو پختگئ ایمان' گہرے شعور' فکری تعمق' تبحرِ علمی' یقینِ محکم کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں لیت و لعل' گفت و شنید' شکوک و شبہات اور بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور انسان اس سرِّ کلیمی تک جا پہنچتا ہے جہاں اس کے حضور تجلیات بے نقاب ہو جاتی ہیں اور افلاک سے نالوں کا جواب آتا ہے۔

اقبالؒ اپنے اس تصورِ عشق کی وضاحت کے لئے اس کا تقابل عقل سے کرتے ہیں لیکن یہاں بھی اقبالؒ نے عقل کو اپنا منفرد اور جداگانہ مفہوم عطا کیا ہے۔ اس سے مراد عقل کا وہ مستحسن مفہوم نہیں کہ جو دانشمندی، حکمت و تدبر، تحقیق و تفتیش، فہم و فراست اور جوہر ادراک سے عبارت ہے، اس حوالے سے تو اقبالؒ بھی اسے مستحسن قرار دیتے ہیں اور اس عقل کے تیاگ دینے کو مسلمانوں کے زوال کا باعث قرار دیتے ہیں ؎

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کیوں کند ہوا آج ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

اقبالؒ زوالِ تحقیق کو اپنے کلام میں جا بجا مسلمانوں کی محرومی کا اصل سبب گردانتے ہیں اور ان کے جوہر ادراک کو صیقل کر کے از سرِ نو ان کی فکر کو مہمیز دینا چاہتے ہیں۔

انگریزی زبان میں اقبالؒ کی معرکہ آراء تخلیق تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

(The Reconstruction of Religious Thought in Islam)

اس کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ لہٰذا اقبالؒ ہرگز اس عقل کے خلاف نہیں ہیں کہ جو انسان کو آمادۂ تحقیق کرتی ہے، راز ہائے سربستہ کی کنہ و ماہیت دریافت کرنے کے درپے ہوتی ہے، سنی سنائی کے حضور سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر تلاش اور جستجو کے عمل سے گزرتی ہے۔ اس عقل کے تیاگ دینے کو اقبالؒ ہرگز نہیں کہتے بلکہ اس کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ تقلید کی روشنی کو خودکشی ٹھہراتے ہیں۔ گھسے پٹے رستوں پر چلنے کی بجائے اپنی عقل سے سوچنے کا درس دیتے ہیں۔ ؎

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

پھر وہ کونسی ''عقل'' ہے کہ جسے اقبالؒ اپنے ''عشق'' کے مقابلے میں کم تر خیال کرتے ہیں، جسے ملعون و مطعون و مذموم ٹھہراتے ہیں، جا بجا جس کی نفی کرتے ہیں، جس کو تذلیل و تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں، جس پر طنز کرتے ہیں، نقد و جرح فرماتے ہیں۔ دراصل یہاں بھی اقبالؒ نے عقل کو ایک منفرد اور جداگانہ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ جہاں اقبالؒ اسے عشق سے نبرد آزما دکھاتے ہیں وہاں اس عقل سے وہ وصف مراد ہوتا ہے کہ جو لیت و لعل، حیلہ جوئی، بہانہ سازی، فرار، نامردی، بزدلی، کام چوری، تساہل پسندی وغیرہ جیسے جذبات سے عبارت ہوتا ہے۔ جو انسان کو کسی مہم جوئی، معرکہ آرائی اور قابل قدر کام کے قابل نہیں رہنے دیتی۔ انسان غیر ضروری طور پر خواہ مخواہ سوچتا چلا جاتا ہے اور کارگزاری کا قیمتی موقع ہاتھ سے گنوا دیتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں عشق فوری طور پر عمل پیرا ہوتا ہے اور میدان مار لیتا ہے۔ ایک کلیم عشق سربکف نظر آتا ہے اور اس کے مدمقابل لاکھ حکیمانِ عقل سر بجیب پڑے ہوتے ہیں۔ ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سُبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زنارئ بت خانۂ ایام ابھی
سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزان شمارِ سحر و شام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہی وہ عشق ہے کہ جو جذبۂ اخلاصِ عمل سے عبارت ہے' جہاں کہنے اور صرف کہنے پر کرنے اور صرف کرنے کو ترجیح حاصل ہے۔ یہ وہ محرکِ اعضاء و جوارح جذبہ ہے کہ جو کتابی باتوں کو روبہ عمل لاکر حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ ؎

شوق کی وارفتگی طے کر گئی کتنے مقام
عقل جس منزل میں تھی اب تک اسی منزل میں ہے

یہ عشق خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرتا ہے۔ انسان کو گومگو کی لایعنی کیفیات سے نکال کر ایسی دولتِ یقینِ محکم عطا کرتا ہے کہ جو سرمایۂ تعمیرِ ملت اور صورت گر تقدیرِ ملت بن جاتی ہے۔ یہی وہ عشق ہے کہ جو دل بن کر دھڑکتا ہے اور آنسو بن کر رواں ہوتا ہے۔ اسی کی تابانیاں افراد اور اقوام کو حیاتِ جاوداں کی تجلیات سے روشناس کرتی ہیں۔ اسی عشق کے ناپید ہو جانے سے عقل سانپ بن کر ڈسنے لگتی ہے اور انسان کو جمود کا شکار بنا دیتی ہے۔ ع

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار

دانش و دین و علم و فن محض بندگیٔ ہوس بن کر رہ جاتے ہیں' یہ عشق نہ ہو تو شرع و دیں محض بتکدہ تصورات ہوتے ہیں اور اپنی حقیقی روح سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں' رسومات باقی رہ جاتی ہیں' مسلمان مرجاتا ہے۔ ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تُو باقی نہیں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمس العلماء (مولانا) الطاف حسین حالی مرحوم

قرآن مجید میں

اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

[آج چاروں طرف سے یہ شور سنائی دے رہا ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کے بعض الفاظ اور آیات کی جو تشریح وتفسیر بیان کرتے ہیں' وہ تفسیر متقدمین کے ہاں نہیں ملتی' اس لئے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور پرویز صاحب کا یہ طرزِعمل دین میں فتنہ (اور نہ جانے کیا کیا) ہے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض نیا نہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسلمانوں میں جب بھی کسی صاحبِ علم وبصیرت نے اپنے غور وفکر سے کوئی ایسی بات کہی جو اسلاف کے ہاں نہیں ملتی تھی' اسے ملحد وزندیق قرار دے دیا گیا اس لئے کہ ان قدامت پرستوں کے نزدیک ندرتِ فکر وخیال بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں لے جاتی ہے۔

جب اسی قسم کے اعتراضات سرسید کے زمانے میں اٹھائے گئے تو حالی مرحوم نے ان کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا جو رسالہ معارف علی گڑھ کی دسمبر 1899ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس مقالہ کو (غیر متعلقہ نظائر و حواشی کے حک کے بعد) درج ذیل کرتے ہیں۔

سرسید کے متعلق اس مقام پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہمیں' پاکستان کی شکل میں جو خطۂ زمین میسر ہے اور جس میں ہمارے اربابِ شریعت' اقامتِ دین اور نظامِ شریعت کی تنفیذ وترویج کے خواہاں ہیں' یہ اسی مردِ حق آگاہ وحقیقت شناس کی دوررنگہی کا تصدق ہے۔ اگر اس وقت سرسید اتنی ہمت اور جرأت سے کام نہ لیتا (اور مولوی صاحبان کی اچھالی ہوئی کیچڑ سے مرعوب ہو جاتا) تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں بالکل اسپین کا نقشہ دکھائی دیتا۔

جہاں تک سرسید کی تفسیر کا تعلق ہے اس کے بیشتر مقامات سے ہمیں اختلاف ہے لیکن جس اصول کے ماتحت اس نے تفسیرِ جدید کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اس سے ہمیں پورا پورا

اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں، سرسید نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ غلطی سے مبریٰ اور وحی کی طرح واجب التسلیم ہے۔ اس کے برعکس، اس نے اپنے ایک لیکچر میں (جو ''اسلام'' کے عنوان سے لاہور میں دیا گیا تھا) اس کا اقرار کیا ہے کہ

میں معصوم نہیں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور مشککین فی الاسلام کے مقابلہ میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔

یعنہٖ یہی کچھ پرویز اپنے متعلق کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں۔ اور پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ قرآن کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی ہے۔ (معراج انسانیت۔ فاتحۃ الکتاب)۔

نیز یہ کہ جو کچھ ہم قرآن سے آج سمجھ سکتے ہیں، وہ لامحالہ ہمارے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہو سکتا ہے جب زمانہ علمی اعتبار سے آگے بڑھ جائے گا تو اس کے لئے ہمارا فہم قرآن کافی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ قرآن کے متعلق اس وقت سمجھا جا رہا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ (سلیم کے نام۔ نیز دیگر مقامات)۔

باقی رہے صاحبِ مضمون (جناب حالؔی) سو ان کے متعلق اس سے بہتر اور کیا کہا جائے گا جو اقبال کہہ گیا ہے

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجا نہا شور افگندے کہ من دارم

یہ بھی عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح ہمارا ملا اس حالی کو منکرِ حدیث اور منکر شانِ رسالت قرار دیتا ہے جس نے حضور سرورِ کائناتﷺ کی شانِ اقدس میں وہ نعت کہی جس کا کوئی جواب نہیں۔ یعنی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
(الخ)

اسی طرح آج اس پرویز کو (معاذ اللہ) منکرِ شان رسالت کہا جاتا ہے جس نے سیرتِ طیبہ پر وہ کتاب (معراجِ انسانیت) پیش کی ہے جس کی مثال (کم از کم) اردو لٹریچر میں کم ملے گی۔

بہرحال، یہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔

اب آپ حالؔی کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ **[طلوع اسلام]**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اعتراض: سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی

جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود بیشمار تفسیروں کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو؟ اولاً رسولِ خدا ﷺ نے جن کے برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہوسکتا جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبانِ مبارک سے ان کا مطلب ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ کے بعد صحابہؓ تابعین تبع تابعین اور علمائے امت نے جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے۔ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا۔ پس زمانہ حال کے مفسر کے لئے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انہی تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں زیادہ شرح وبسط یا زیادہ اختصار یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دے۔ یا ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کا ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کئے ہوں۔ چنانچہ اسی شبہ کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ وتابعین کو اور نہ دیگر علمائے امت کو۔

محکمات و متشابہات: اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے۔

محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

متشابہات۔ وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہوسکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں۔ مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انہوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص وعوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ان کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟ پس تقاضائے حکمت یہی تھا کہ ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں۔''

اندازِ تخاطب: شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقایق علم وحکمت تک پہنچنے سے پہلے ان کی اصل خلقت میں ودیعت تھی ان سے خطاب کیا ہے اور

اسی لئے (ان کی سمجھ کے موافق) فرمایاالرحمن علی العرش استویٰ۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ''خدا کہاں ہے؟'' اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ مومنہ ہے۔'' یعنی آنحضرت ﷺ نے باوجود یکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم وادراک سے اور خاص کر عرب کے امیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا اور ان کو مجاز واستعارہ اور تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے تاکہ امی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں چونکہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے ان میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔

اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحبؒ انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ ''ومن سیرتھم ان لا یکلموا لناس الا علیٰ قدر عقولھم التی خلقوا علیھا وعلو مھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ۔''

متشابہات کی تاویل: تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے ''وما یعلم تاویلہ الا اللہ اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں۔ یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بمالا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ وقد اتفق اصحابنا و غیرھم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالیٰ بمالا یفید یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنی سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لئے نہ ہو اور ہمارے علمائے مذہب اور ان کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے۔

غرضیکہ آیت مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم قطعاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدا و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیاتِ متشابہات میں بطور مجاز و

استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یومنون بالغیب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ور اس لئے انسان جن الفاظ و عبارات سے ان حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنیٰ مقصود سے قاصر ہوگی۔

طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتا ہے کہ المتشابہ الذی یحذر منہ ھو صفات اللہ تعالیٰ التی لا کیفیۃ لھا والاوصاف القیمۃ التی لا سبیل الیٰ ادراکھا بالقیاس والا ستنباط ولا سبیل الی استحضارھا فی النفوس۔ یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے وہ صفاتِ باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہوسکتا اور نہ لوگوں کو اس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔''

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیاتِ متشابہات میں وہ اسرار وحقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۂ تکویر میں ہولِ قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے واذا العشار عطلت یعنی جبکہ عنقریب بیاہنے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور ان کی کوئی خبر نہیں لے گا بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی اس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اس کی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انہوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جبکہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

اسلاف کا مسلک: لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لئے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالک سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ ''استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔''

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا' اس وقت اہل کتاب تحریفِ کتبِ مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے وہ اکثر اپنے اغراضِ فاسدہ کے لئے کتبِ مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح

وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہلِ کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہل کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصولِ دین میں عموماً باہمدگر مشابہت رکھتے تھے اس لئے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لئے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں [1] چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ اور آنحضرت ﷺ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ من فسر القران برایہٖ فلیتبؤ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علی متعمدا فلیتبؤ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علیٰ متعمداً فلیتبئو مقعدہ من النار۔ اسی بناء پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے حذر کرتے تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں اس کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انکے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کو سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استواء کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالانکہ عربی زبان جس میں شاعری نزول قرآن کے وقت حدکمال کو پہنچی ہوئی تھی استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالا مال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے تاویلِ متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت ﷺ کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللھم

[1] یعنی جو حقائق انسانی عقل سے ماوراء ہیں اور ان کا بیان مجاز و استعارہ کی شکل میں ہوا ہے ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (طلوع اسلام)

فقهه فی الدین و علمه التاویل نعوذ باللہ بیکار ٹھہرتا ہے۔ باوجود اس کے کہ سلفِ صالحین جہاں تک ہوسکتا تھا بغیر روایت کے سنے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے۔ تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا راستہ محدود رہے۔

ہمارے زمانے کا تقاضا: لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علماء نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض ازراہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز، استعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدرِ ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے۔ یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثلاً مقاصد۔ مواقف۔ تفسیر کبیر، دُررِ غُرر، تہافتہ الفلاسفہ اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلہ میں لکھی ہے۔ اس میں بھی اس اصول کو قاعدہ مسلمہ اہل اسلام قرار دیا ہے بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ علیهم ان یقنعوا بما تقبله عقولهم ثم مالم تقبله و یرفضه البرهان العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل والعقل (حمیدیہ ص 38) یعنی ان کو چاہئے کہ جس بات کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

پہلے بھی ایسا ہوا ہے: اگرچہ ابوالحسن اشعری جو کہ فرقہ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے

مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں کیونکہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرق بین الاسلام والزندقۃ میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس مقام پر ہم آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیاتِ متشابہات کے معنی ابتداء میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم وحکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم (جو زمین وآسمان پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش وکرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کئے جائیں۔

مزید تحقیق کی ضرورت: لیکن چونکہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھیں اس لئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں اس زمانہ میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی لوگ ان آیتوں کے الفاظ کو (جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔ اور اب تک بھی ان ملکوں کے بعض علماء [1] جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم وحکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی گردیت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فرشنٰھا اور دحاھا اور طحٰھا اطلاق کئے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لئے قرآن کے بعض الفاظ جو زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون وچرا نہیں کی لوگ ان آیتوں کو ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ

---

[1] شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانہ کے ایک قشیری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی گردیت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔ شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کر دیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں'' حالی۔

درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سـمـاء جو قرآن میں جابجا وارد ہوا ہے۔اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔لیکن چونکہ اس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیطِ عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اس لئے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود ہونے یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اشعریہ اور معتزلہ: اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔اس لئے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا اور سب سے بڑا مانع تاویلِ متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویلِ متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لئے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنہوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویلِ متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے' جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اس قدر وہ' ان کا مذہب اور ان کے اصول اور ان کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا۔یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہو گئے۔یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں صرف ان کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔چنانچہ قفالؒ جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی معتزلہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بناء پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔مـن اصـول الـديـن تـرك الـخـوض بـالـعـقـل فـي المتشابهات من الكتاب و السنة اس کے بعد فرماتے ہیں ومن ذلک (ای من المتشابهات) امور كثير لا يدرى اريدت به حقيقة الكلام او المجاز اقرب اليها وذلک فی لم يجمع عليه الاالـلامة ولم ترتفع فيه الشبهة۔یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں

جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور یہ تردد ان بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا۔''

شاہ ولی اللہ کا مسلک: شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ ان مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو متحمل ہیں ان سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے تفسیر کبیر اور حجتہ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہئے کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اس سے ہدایت پاسکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اس وقت بھی اس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

قرآنی حقائق لامتناہی ہیں: علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب ''مدخل'' میں لکھتے ہیں قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القران لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علیٰ کثرۃ الرد فعجائب القران لا تنقضی الی یوم القیمٰہ فکل قرن لا بدلہ ان یاخذمنہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالیٰ بھا وضمھا الیہ برکۃ ھذہ الامۃ سائرۃ الی یوم الساعۃ۔'' یعنی ''آنحضرت ﷺ نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ ''اس کے عجائب یعنی دقائق واسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پرانا نہ ہوگا۔'' پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لئے ہر زمانہ کے لوگوں کو چاہئے کہ اس سے فوائد کثیرہ جو ان کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تاکہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں ''قال علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ۔ یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ و تبئین الاحکام یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر'' یعنی برکت اور خیر میں' لوگوں کو خدا کی طرف

بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔

دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق واسرار امت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقائق واسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجتہ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ

کم من معان دقیقة من اسرار القران یخطر علی قلب المتجر دین للذکر والفکر یخلو عنها کتب التفاسیر ولا یطلع علیها افاضل المفسرین یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقائق واسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو ان کی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئی ہیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق واسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عندالضرورت اجماع امت کے خلاف ان مقامات میں خوض کرنا اور ان متاشبہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ان کے معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

تقاضائے وقت: ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام پر اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ

ضرورتیں ممنوعات کو مباح وجائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا چونکہ ان کو اس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لئے حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔

ابوسلمہؒ جب بصرے میں آئے تو انہوں نے حسن بصری سے کہا کہ ''میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن وحدیث کے فتویٰ نہ دینا۔''

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو وہ ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو اور دوسرا تیسرے کی طرف۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔ یعنی جب کسی کو اس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب وسنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے دیکھ کر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار و ناچار اس پر بحث کرنی پڑی۔ بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لئے سخت خونریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ مسلمان کیوں قتل کئے جاتے ہیں؟ تو ان کو یہ جواب ملا کہ القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور اس قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب تک شک اور وسوسے کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چونکہ ان میں کثرت سے آیاتِ متشابہات وارد ہوئی تھیں اس لئے اگرچہ ایک مدتِ دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علمِ انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔

قرآن مجید میں جو الفاظ یا آیتیں اب تک ایسی موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایہء ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنے اختیار کئے جائیں اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

بینا و نابینا: مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ:

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں مخالفت کی کوئی آواز نہیں پہنچی ان کے نزدیک تو اس کے سوا کسی

چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے ان کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے کہ

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ اسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویل متشابہات پر مجبور کیا تھا وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حد غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علماء و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لئے حاصل کرتے تھے مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگئی ہے۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو یا اہل حرفہ ہو مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لئے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے اس کے سوا اس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لئے جو شبہات ان سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کے دفعیے کے لئے اکثر حالتوں میں صرف لا نسلم کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانہ میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقراء پر رکھی گئی ہے اور اس لئے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لا نسلم کہہ دینے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرضیکہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں۔ اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لئے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے تک پہنچ گئے ہیں ان میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضروری ہے کہ یا تو قرآن کو حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں [1]۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر ان کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو ان آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے ان کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے ہم

---

[1] طلوع اسلام کا اس باب میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق جو کچھ ہمارے زمانے نے معلوم کیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہمیں اس باب میں مزید تحقیق کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہوگی تو اس کی تحقیق یقیناً قرآن کی تائید کرے گی۔

مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

یہ جدت طرازیاں: جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ:

''جو معنی قرآن کے انہوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔ سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔''

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اس زمانے میں جبکہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

صاف بات: ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجتہ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادھی سمجھ کے موافق (جو علم وحکم تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز استعارہ و تمثیل کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقلِ طبعی سے ترقی کر کے علم وحکمت کے اعلیٰ درجہ تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی ان الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انہی پر قانع رہیں۔ مگر جوں جوں حقائقِ اشیاء ان پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود ان پر کھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے اب یا آئندہ ایسے بیان کئے جائیں جو اصولِ عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے ان کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اس کی نسبت صرف اس بناء پر کہ نزول قرآن کے وقت شارع نے ان کو بیان نہیں کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنے نہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے مسئلہ جبر وقدر کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اس پر بحث شروع ہوگئی۔ چنانچہ عمرو بن عاص اور ابوموسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل ونحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے ان آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ پر کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علماء اور ائمہ نے بیان کئے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصولِ عربیت اور اسلوبِ قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کو رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے ان کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انہوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔ [1]

وما توفیقی الا باللہ

---

[1] یہ مزید بحث ہماری نظر سے نہیں گذری۔ نہ ہی اس کی اب چنداں اہمیت باقی ہے۔ (طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ عنایت اللہ اثری (مرحوم)

مسجدِ اقصیٰ

سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ ..... (17/1)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کو لے گئی۔

اس آیت میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے۔ جب حضورﷺ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

پرویز مرحوم نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچا دیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے متقدمین میں سے (غالباً) کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو اور غلط بات غلط ہے۔ خواہ اسے ہزار بار کیوں نہ دہرایا گیا ہو (اس کے بعد ''شاہکار رسالت'' میں موجودہ مسجدِ اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی تھی)۔

اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیرآبادی۔ ثم گجراتی) کی کتاب 'حصولِ تیسیر البیان (علیٰ) اصولِ تفسیر القرآن' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے مفہوم القرآن میں لکھا گیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مولانا صاحب فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو واقعی باعثِ تعجب اور اس لئے وجۂ حیرت ہے۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن

(از مولانا عنایت اللہ اثری۔ وزیرآبادی۔ گجرات۔ شائع کردہ اپریل 1955ء)۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ..... عبداً شکوراً (بنی

اسرائیل 17) اللہ رحمٰن و رحیم کا نام لے کر پڑھو۔ چرچا کرو (اور) وعدہ خلافیوں اور غلط پیشگوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تا کہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کر دے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے اردگرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقۂ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے اسے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آئتیں جو کہ پیش گوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے۔ ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیشگوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تا کہ وہ پوری نہ ہو سکے۔ اسے اللہ دیکھتا رہا۔ اب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعونی ناکامی اور موسوی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیشگوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آئندہ چل کر آ رہا ہے۔ جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقعہ ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں۔ قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں بھی کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے پوری ہوئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچایا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلا کر آج ہم تمہیں اس بندۂ شکر گزار کی سنت پر دعوت دے کر شکر گزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ 111-113) ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً اس کے اسراء نبوی کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر متونِ حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زرائد میں قتادہ اور زربن جیش سے مقطوعاً اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے موقوفاً اور ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مستر د نہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب کا ذکر ہے ان

میں آپ کے ایاب کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ 114)۔''

(سورۃ الانفال میں جو عدوۃ الدنیا اور عروۃ القصویٰ کا ذکر آیا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ) بدائکہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالاولیٰ قصویٰ ٹھہرا اور اس کی مسجد (نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفا جلد نمبر 1 صفحہ 16 میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا مسجد اقصیٰ بھی ہے (ص 121)۔ صحیح بخاری و پارہ 15 صفحہ 476) میں ہے کہ مسجد نبوی جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری پارہ 15 صفحہ 477) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے اور وفاء الوفاء (جلد 1 صفحہ 232) میں بحوالہ ابن اسحٰق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم ہے۔ اور جہاں پر مسجد قبا تعمیر ہوئی۔ وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالمؓ تھے اور خطیب مصعب تھے..... فتح الباری (پارہ 15 صفحہ 476) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی۔ (صفحہ 24-122)۔

[اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے الخلوا المسجد کما دخلوہ اول مرۃ تو اس میں المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیۃ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا۔ (صفحہ 244-125)]

☆☆☆

مولانا مرحوم نے اپنے مقالہ میں ''اسریٰ'' کا ترجمہ ''لے گیا'' کے بجائے ''لے جائے گا'' (روانہ کردے گا) کیا ہے۔ یعنی ماضی کے بجائے مستقبل۔ اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دیئے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

☆☆☆

1۔ (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبوی کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا (زاد المعاد۔ عمدۃ القاری۔ وفاء الوفاء)۔ [اسی قصویٰ پر حضور ﷺ نے تمام بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے]

2۔ ان مقامات پر اردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، کراچی

روشن خیالی کے اندھیرے

کاروانِ انسانیت اول دن سے آج تک برابر آہستہ آہستہ ترقی کرتا چلا جا رہا ہے آپ اس کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ حضرت نوحؑ کے دور میں کشتی بنانی نہیں آتی تھی۔ کشتی بنانے میں وحی الٰہی نے ان کی مدد کی **واصنع الفلک باعیینا و وحینا** (11/37)۔ اس کے برخلاف آج ہر طرح کے جہاز بآسانی بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک بات چونکہ قرآن میں مذکور ہوگئی ہے اس لئے اس کا علم ہمیں ہوگیا ہے ورنہ معلوم نہیں کون کون سی چیزیں ایسی ہوں گی جن کی ساخت و بناوٹ میں وحی نے مدد کی ہوگی۔ کئی ہزار سال کی محنت میں عقل انسانی نے ٹیکنالوجی میں جو ترقی کی ہے وہ ہر شخص کو محو حیرت کر رہی ہے۔ اسی طرح کائنات کی تسخیر میں انسان نے بڑی ترقی کی ہے۔ ابتداء میں انسان ہر چیز کو دیوی دیوتاؤں کی کرشمہ سازی خیال کرتا تھا۔ بارش، دھوپ، فصلوں کا پکنا، بیماری، صحت، گرج، چمک، سب میں توہم پرستی شامل تھی۔ آج انسان نے ان سب پر قابو پا لیا ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی تعمیر میں بھی انسان نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ پہلے معاشروں میں ظلم و جور، سلب و نہب، قتل و غارت اور استحصال پر مبنی قوانین جاری ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ معاشرے ترقی کرتے چلے گئے اور آج زیادہ تر ممالک میں تہذیب یافتہ معاشرے قائم ہیں۔ انسان نے یہ ترقی رفتہ رفتہ کی ہے۔ بالکل ابتدائی معاشروں اور ان کے علوم کا تو پتہ نہیں البتہ یونانی فلاسفرز اور رومن ایمپائر کے دور سے تاریخی حالات تحریری طور پر موجود ہیں۔ یونانیوں نے فلسفہ میں اور رومنز (Romans) نے قانون میں اس درجہ کاوشیں کی ہیں کہ آج تک ذہن انسانی ان سے متاثر چلا آ رہا ہے۔ موجودہ دور میں مغربی ممالک نے تقریباً پندرھویں صدی عیسوی سے ترقی کرنی شروع کی ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یورپ کے تمام ممالک بیک وقت اس ترقی میں شامل ہوئے اور پورا یورپ بیک وقت بیدار ہوا ہے۔ ان ممالک کی Contribution میں کمی بیشی تو ضرور ہوئی ہے لیکن اس میں شامل سب تھے۔ یورپ میں روشن فکری اور روشن خیالی Renaissance (رینے سانس) یعنی نشاۃ ثانیہ کے بعد

سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نشاۃ ثانیہ اٹلی سے شروع ہوئی اور پندرھویں اور سولھویں صدی تک جاری رہی۔ اس میں بھی یورپ کے تمام ممالک نے حصہ لیا اور بے شمار مفکرین نے مختلف علوم وفنون میں نایاب کتابیں تحریر کیں۔ اس دور کے انگریزی مفکرین میں رسکن' پیٹر اور سیمنڈز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ وہ کثیر تعداد میں تھے' لیکن جس شخص کے فکر نے پورے یورپ کو متاثر کیا وہ Desiderus Erasmus (1466-1536) تھا۔ وہ پیدا تو Rottedam میں ہوا' لیکن سارے یورپ میں گھوما اور انگلینڈ بھی متعدد بار گیا۔ یہاں تحریک نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کے احصاء مطلوب نہیں ہے۔ یہ چند باتیں صرف حوالہ کے طور پر تحریر کی گئی ہیں۔ مقصد تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں تقریباً 500 سال سے روشن خیالی اور فکری آزادی کا دور دورہ ہے۔ روشن خیالی اور آزاد فکری سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہاں فکر میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ اور عقل انسانی جس نتیجہ پر بھی پہنچے وہ اس کا اظہار کرسکتی ہے۔ عقل انسانی جب آزاد ہوتی ہے تو وہ کسی بھی نظریہ کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی قانون بنانا چاہے بنا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ Free sex اور اس سے بھی بڑھ کر Homosexuality تک جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ ان معاشروں میں مستقل اقدار Permanent Values کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اقدار (Values) تو وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ جب کوئی معاشرہ وحی کو مانتا ہی نہیں' تو وہ مادر پدر آزاد ہے' اس کو کسی قدر کی پابندی ہی نہیں ہوتی۔ البتہ معاشرہ کے انتظام کے لئے وہ جو بھی قانون بنائیں وہ ان کی پابندی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم عقل انسانی نے آہستہ آہستہ تجربہ سے فائدہ اٹھا کر' فلاحی معاشرے بنا ہی لئے ہیں۔ اگرچہ ان کو اس کے لئے بہت Cost دینی پڑی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی دنیا میں امن و سکون قائم نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص سے خائف بھی ہے اور انسان ہی انسان کا استحصال بھی کر رہا ہے۔ اسی طرح اقوام کی حالت ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کو Exploit کر رہی ہے۔ یورپ کی دو عظیم جنگوں نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کے سامنے مذہب غلط شکل میں تھا' کاش اگر ان کے سامنے وحی اپنی منزہ شکل میں ہوتی تو آج دنیا کی حالت ہی دوسری ہوتی۔ آج دنیا میں جو اندھیرے ہیں وہ نہ ہوتے۔ اس قدر روشن فکری کے بعد بھی جو اندھیرے ہیں وہ صرف وحی سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔ اگر وہ معاشرے وحی کے نور سے مستفید ہوتے تو وہ اندھیرے ان میں نہ ہوتے اور آج دنیا جو جانوروں کا بھٹ بنی ہوئی ہے' یہ حالت نہ ہوتی۔ اس وقت سب سے بڑا اندھیرا' یا انسانیت کو درپیش مسئلہ' جس کا حل تنہا عقل انسانی پیش نہیں کرسکتی' یہ ہے کہ دنیا میں امن کس طرح سے قائم کیا جائے اور افراد اقوام کو سلب ونہب اور جرائم کے ارتکاب سے کس طرح روکا جائے۔

سلسلۂ ارتقاء میں حیوانات کی اگلی منزل انسانیت کی ہے۔ انسان کی طبعی زندگی کے وہی تقاضے ہیں جو حیوانات کی

طبعی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں' کھانا' پینا' بچے پیدا کرنا۔ بیمار وصحت مند ہونا' تحفظ خویش' خطرات سے مقابلہ کرنے کے لئے تدابیر سوچنا' اپنی نسل کو برقرار رکھنا' جنسی خواہش کی تکمیل کرنا۔ یہ تقاضے حیوانات اور انسان میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی جبلت ایسی بنائی ہے کہ اس پر فطرت کا کنٹرول ازخود جاری رہتا ہے۔ گائے کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہو' وہ گوشت کبھی نہیں کھائے گی۔ Mating Season کے علاوہ جانوروں کی جنسی خواہش کبھی بیدار نہیں ہوتی۔ جانوروں کی جبلت کے اس کنٹرول کا یہ نتیجہ ہے کہ حیوانات کبھی ''جرائم'' کے مرتکب نہیں ہوتے یعنی وہ اپنی حد سے آگے نہیں جاسکتے۔ لیکن انسان پر فطری وجبلی طور پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کی صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کے فطری تقاضے تو وہی ہیں جو حیوانات کے ہیں لیکن ان پر فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اسے ان پر خود پابندی عائد کرنی ہوتی ہے۔ اگر وہ ان پر پابندی عائد کرے تو جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا لیکن اگر وہ پابندی عائد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ جرائم کا ارتکاب ہوگا۔ بلکہ ان کے جرائم کی شدت بھی زیادہ ہوگی۔ کیونکہ جانور کے پاس تو صرف اپنی ہی محدود قوت ہوتی ہے لیکن انسان کے پاس تو ایٹم بم کی قوت بھی مہیا ہوتی ہے۔ اگر انسان کے جذباتی تقاضوں پر پابندی نہ ہو تو اس کے فساد و ہلاکت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہی وہ عالم گیر جرائم ہیں جو آج افراد واقوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب بنیادی و اساسی سوال یہ ہے کہ نوع انسانی پر پابندیاں کس طرح عائد کی جائیں۔

ہمارے اس دور میں زندگی کا تصور سیکولر ہے جس سے یہ مراد ہے کہ زندگی صرف حیوانی سطح تک ہی ہے اور صرف طبعی زندگی ہے۔ اب جبکہ زندگی صرف حیوانی سطح تک ہو اور فطرت کی قوتیں مسخر کر لینے سے' قوتیں بے اندازہ حاصل ہوگئی ہوں اور فطری وجبلی طور پر کوئی پابندی نہ ہو' تو پھر دنیا کی تباہی و بربادی کی وہی صورت ہوگی جو آج دنیا میں موجود ہے۔ کسی جگہ بھی انسانیت کو سکون و آرام نہیں ہے۔ امن عالم قائم کرنے والے ادارے اور دنیا کی بااثر ہستیاں' انسان پر خارج سے پابندیاں عائد کرنے کی اسکیمیں سوچتی رہتی ہیں۔ لیگ آف نیشنز' یو۔این۔او کے ادارے اور اسی قسم کے بے شمار ادارے آئے دن بنتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ قوانین بناتے ہیں اور پھر خود ہی ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خارج سے پابندیاں عائد کرنے کا طریق کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیاب علاج وہ ہے کہ جس میں انسان خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کرے۔

جب تک انسان کی زندگی حیوانی وطبعی زندگی تک رہے گی' انسان اپنے اوپر ازخود پابندیاں بھی عائد نہیں کرے گا۔ ہاں اگر انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ زندگی صرف طبعی زندگی ہی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی بھی ہے جو حیوانی زندگی سے ارفع واعلیٰ ہے اور اس زندگی کا سنوارنا اس کا مقصدِ حیات ہے تو پھر انسان پر ازخود پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔

انسان کو اگر اس بات کا پورا پورا یقین ہو کہ اگرچہ

اس کی طبعی زندگی کا قیام بھی ضروری ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کی اہمیت اس کی طبعی زندگی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔اس لئے جب کبھی اس کی طبعی زندگی اور انسانی زندگی میں Tie آ پڑے گی تو وہ انسانی زندگی کے تقاضے پورے کرے گا۔

انسانی زندگی کی پرورش اور اس کا استحکام مستقل اقدار کے ذریعے ہوتا ہے اور مستقل اقدار کے تصور سے ہی اخلاقیات کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اسی سے کیریکٹر بنتا ہے۔ اگر مستقل اقدار کا تصور نہ ہو تو نہ تو اخلاقیات کا تصور بن سکتا ہے اور نہ ہی کیریکٹر پیدا ہوتا ہے۔ مستقل اقدار کو پیش نظر رکھنا اور ان پر عمل کرنے سے ہی اچھا کیریکٹر اور پختہ سیرت بنتی ہے۔ زندگی، نفس یا خودی، کی پرورش یا بالیدگی کی وجہ سے انسان نہ تو کسی جرم کا ارتکاب کرے گا اور نہ ہی دوسروں پر غلبہ و تسلط حاصل کرے گا۔ یہ پابندیاں انسان خود اپنے اوپر عائد کرے گا اور ان پابندیوں پر عمل کرنے سے دنیا میں امن قائم ہو گا۔ پھر نہ کسی ادارے کی ضرورت ہو گی اور نہ کسی یو۔این۔او کی۔ شرط صرف انسانی زندگی پر یقین اور اس کی پرورش کو مقصد حیات قرار دینا ہے۔

بدچلنی و بدکرداری کی روک تھام کے لئے معاشروں میں قوانین وضع کئے جاتے ہیں لیکن جن لوگوں تک قانون کی گرفت نہیں ہوتی یا جن معاشروں میں قوانین کا درست اطلاق نہیں ہوتا اور وہاں بدچلنی کی روش عام ہو جائے تو آپ قوانین کے ذریعے بدچلنی کو نہیں روک سکتے۔ ہاں اگر خود ہی کسی انسان کو اس بات کا احساس ہے کہ بدچلنی کی وجہ سے اس کی خودی یا اس کی زندگی کو اضمحلال وضعف حاصل ہو گا ، وہ کبھی بدچلنی نہیں کرے گا۔ حضرت یوسفؑ کو ہر چند کہ عزیز مصر کی بیوی نے بدچلنی کی طرف دعوت دی بلکہ زبردستی پر بھی اتر آئی لیکن حضرت یوسفؑ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے اور یہی ارشاد فرمایا کہ: **السجن احب الی مما یدعوننی الیه** (12/33)۔ جس بات کی طرف یہ دعوت دیتی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے۔

عجب درماندہ ام درکار ایناں
مرا زندان بہ از دیدارِ ایناں

اور اس کی وجہ وہی تھی جو کہ قرآن کریم نے خود یہاں بیان فرما دی کہ **ولقد همت به وهم بها لولا ان را برهان ربه** (12/27)۔ اگر ان کے سامنے اپنے رب کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتے۔ یہاں برہان کا لفظ وحی کے لئے استعمال ہوا ہے کہ اگر وحی الٰہی کی تعلیم حضرت یوسفؑ کے سامنے نہ ہوتی تو وہ بھی برائی کا ارادہ کر لیتے۔ حضرت یوسفؑ نے برائی کا ارادہ جو نہیں کیا تو کوئی خارج کی پابندیاں ان پر نہیں تھیں بلکہ ان کی اپنی داخلی پابندی تھی جس نے انہیں برائی سے روکے رکھا۔ اسی طرح جب ساحرین دربار فرعون حضرت موسیٰؑ کی تعلیم پر ایمان لے آئے اور حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا نبی تسلیم کر لیا تو فرعون نے انہیں بڑی تہدید و توبیخ کی کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا۔ **فلا قطعن ایدیکم و ارجلکم من خلاف**

(20/71)۔ اور میں تمہیں صلیب پر لٹکا دوں گا (20/71) تو انہوں نے بھی موت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور علی الاعلان کہا کہ **واللہ خیر و ابقیٰ** (20/73) تمہاری فرماں پذیری کے مقابلہ میں اطاعتِ خداوندی بہت بہتر ہے۔ فرعون کی موت کی دھمکیوں سے بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ یہ سب کچھ کیا تھا۔ یہ ان کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں تھیں بلکہ اپنی رضا و رغبت سے اختیار کی ہوئی پابندیاں تھیں۔

اسی طرح ایک موقعہ پر جب فرعون اس درجہ غضبناک ہوا کہ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور میں دیکھوں کہ وہ اپنے پروردگار کو اپنی مدد کے لئے بلائے تو اس کے اس غصہ و غضب کے باوجود مومنِ آل فرعون نے اسے ٹوکا اور پورے بھرے دربار میں' اس کے علی الرغم' ایک پرزور تقریر کی جو کہ سورۃ مومن کی آیت 27 سے 44 تک پر مشتمل ہے۔ ان خطرناک حالات میں جو اس قدر موثر تقریر مومن آل فرعون نے کی' یہ اس کی داخلی تحریک Urge تھی۔ اس میں خارج سے کوئی دباؤ اس پر نہیں تھا۔

قرآن کریم کی تعلیم کا ملخص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ طبعی زندگی اور انسانی زندگی کا واضح تصور ہمیشہ پیش نگاہ رکھنا چاہئے۔ زندگی کا انسانی تصور اور اس کے استحکام کو مقصد حیات سمجھنا ہی وہ اساس محکم ہے جو افراد و اقوام کو جرائم کے ارتکاب اور دوسری اقوام کے استحصال وسلب ونہب سے روکتی ہے۔ اور امن عالم کے قیام کا باعث بنتی ہے۔ انسانی زندگی کے تصور کا انکار ہی وہ اندھیرا ہے جس کی وجہ سے دنیا ایک باطنی اضطراب میں مبتلا ہے۔

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ Renaissance کے بعد علوم کی خوب ترویج ہوئی۔ بائبل کی تعلیم اور ان کے مذہبی حلقہ' یعنی Priests اور Friars کی سیرت' اتنی بری اور داغدار تھی کہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے متنفر ہو گیا مگر ان میں ایک کافی بڑا طبقہ طبعاً مذہبی واقع ہوا تھا۔ ایک طرف تو ان لوگوں کی طبیعت مذہب کی طرف راغب تھی اور وہ مذہب کو ترک نہیں کر سکتے تھے لیکن دوسری طرف بائبل کی تعلیم انہیں اپیل نہیں کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کو مانتے رہے اور خارجی کائنات میں بھی اس کا اقتدار تسلیم کرتے رہے۔ لیکن بائبل سے بھی انکار جاری رکھا۔ وہ وجود باری کے منکر نہیں تھے' صرف بائبل کے منکر تھے۔ یہ طبقہ Theist یا Deist کہلاتا تھا۔ یہ وجود باری کے قائل لیکن وحی یا وحی کی تعلیم کو عملاً متشکل کرنے کے منکر تھے۔

نزول قرآن کے وقت بھی اس دور کے دانشوروں کی یہ ہی کیفیت تھی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کام میں لگایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے' پھر وہ کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں نیز 43/9 ,39/38۔

ان کے اس اقرار کے بعد قرآن کریم نے ان کفار سے کہا تھا کہ جب تم اس بات کے قائل ہو کہ خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ ہے' تو تم اپنی تمدنی و معاشرتی

زندگی میں اس کے قوانین کو کیوں رائج نہیں کرتے۔ حالانکہ جس قدر خارجی کائنات کے قوانین صحیح نتائج برآمد کر رہے ہیں' اسی طرح تمہاری تمدنی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین درست نتائج برآمد کریں گے۔ یہی سوال یورپ کے Deists یا Theists سے قرآن کرتا ہے کہ جب تم خدا کے منکر نہیں ہو سکتے اور اسی کا اقتدار خارجی کائنات میں بھی مانتے چلے آ رہے ہو تو اپنی داخلی دنیاوی زندگی میں وحی کی تعلیم کو کیوں رائج نہیں کرتے۔ لیکن ان کی دقت یہ تھی کہ ان کے یعنی یورپ کے دانشوروں کے سامنے قرآن نہیں تھا اور ہم نے ان تک قرآن پہنچایا نہیں تھا۔ اس لئے عمداً یا مجبوراً وہ وحی الٰہی سے مستفید نہیں ہو سکے اور اپنا معاشرہ وحی کے مطابق متشکل نہیں کر سکے۔ یہ موجودہ دور کی روشن خیالی کا دوسرا اندھیرا ہے جس کی زیادہ تر ذمہ داری ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس دور میں امریکہ میں اسلام پر کام کرنے کا بہت وسیع میدان ہے۔ اس کا تذکرہ مضمون کے آخر میں پیش خدمت کیا جائے گا تاکہ جو حضرات اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں ان کے لئے اس میں ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں گی۔

اس دور کا ایک ایسا اندھیرا جس نے نہ صرف عالمگیر حقیقت اختیار کر رکھی ہے بلکہ جس نے انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ انسانیت کو وطن کی حدود میں تقسیم کر کے' ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا تھا کہ **وما کان الناس الا امۃً واحدۃً** (10/9)۔ ساری نوع انسانی ایک امت واحدہ تھی۔ ایک ہی جماعت' ایک ہی قوم تھی۔ آہستہ آہستہ باہمی اختلافات کر کے خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ گئے۔ اور اس طرح نوع انسانی کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ چونکہ یہ تقسیم ذاتی یا قبائلی مفادات کے پیش نظر ہوتی تھی اس لئے اس تقسیم کو دور کر کے دوبارہ وحدت پیدا کرنا بھی فکر انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے انبیاء کرام تشریف لائے **وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفو فیہ** (2/213)۔ انبیاء کرام کے ساتھ ان کی کتاب آئی تاکہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کر کے ان کے اختلافات دور کریں۔ اس آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کا دور ہونا صرف وحی کی رو سے ہی ہوسکتا تھا۔ یہ انبیاء کرامؑ کا کام تھا کہ وہ اختلافات کا فیصلہ کتاب کے ذریعے فرمائیں۔ ورنہ انسانیت کے باہمی مفادات انسانیت میں وحدت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ وحی کا مقصد نوع انسانی کی عالمگیر تشکیل ہی تھا۔ جب انسانیت بالغ ہوگئی اور ایک عالمگیر وحدت کا امکان نظر آنے لگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ضابطۂ حیات بھیجا گیا جس میں ہدایت سب **''الناس''** کے لئے ہے۔ یہ ضابطۂ حیات اللہ تبارک و تعالیٰ کو بطور **رب الناس' ملک الناس' الہ الناس** کے متعارف کراتا ہے خود حضور ﷺ کو بھی **کافۃ للناس** کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اس ضابطۂ حیات کو بھی **لبصائر للناس** (45/20) کہا گیا ہے۔ یہ ضابطہ کسی خاص قوم یا

خطہ کے لئے نہیں ہے۔ کعبہ کو انسانیت کا مرکز قرار دیا یہ **قیاماً للناس**' وہ مقام ہے جہاں انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔ اگر چہ ہر فرد یا ہر قوم اپنے ہی نفع ونقصان کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے مستقل اقدار کے پیمانوں کے مطابق فرمایا **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13/17)۔ اسی مسلک' اسی نظریہ' اسی قوم کو بقا حاصل ہوسکتی ہے جو ساری دنیا کے لئے نفع بخش ہو۔ لیکن افسوس کہ آج کی تاریکی اور سخت اندھیرے نے اس نصب العین کو پس پشت ڈال دیا۔ انسانیت انسانیت کی دشمن ہوگئی۔ یورپ کی دو جنگیں اس اندھیرے کے باعث برپا ہوئیں اور آج بھی انسان اسی اندھیرے کے سبب دوسرے انسان کا دشمن ہے۔

قرآن کریم نے نور کا لفظ واحد استعمال کیا ہے۔ کیونکہ نور ایک ہی ہوتا ہے اور اندھیروں کے لئے جمع کا صیغہ ظلمات استعمال کیا ہے کیونکہ اندھیرے بہت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ لیکن نور کی آمد سے سب اندھیرے دور ہو جاتے ہیں' اندھیروں میں سے ایک عالمگیر اندھیرا ملکیت زمین کا بھی ہے۔ اس کے بھی عالمگیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ابتداء سے ہی تباہی کا باعث رہا ہے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ زمین کسی کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اس لئے کہ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھائے **سواء للسائلین** (41/10) جس طرح دھوپ' ہوا' پانی' روشنی' اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ نعماء میں سے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی ایک نعمت ہے اس کی ملکیت صرف اس وجہ سے کر لی ہے کہ آج سے کئی ہزار پیشتر جو شخص سب سے زیادہ طاقتور تھا' اس نے اس کے ایک وسیع وعریض حصہ پر قبضہ کر لیا اور یہ قبضہ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا گیا اور یہ طویل قبضہ ہی ملکیت کا جواز بن گیا۔ ورنہ حق ملکیت تو کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے فرمایا **والارض وضعھا للانام** (55/10)۔ ساری زمین لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا **وجعلنا لکم فیھا معایش ومن لستم لہ برزقین** (15/20)۔ اور ہم ہی نے انہیں تمہارے واسطے زندگی کے ساز وسامان بنا دیئے اور ان جانوروں کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔ ان آیات کریمات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وسائل پیدا وار اللہ تعالیٰ کی بخشائش ہیں جن کا مقصود تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ لیکن آج کل اس سے زیادہ کسی اور ذریعہ کو Exploit نہیں کیا جاتا۔ سارے سال غریب کسان محنت کرتا ہے۔ دھوپ اور بارش میں خود بھی محنت شاقہ کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھی اس کی اس محنت میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا ماحصل وہ جاگیردار یا مالک زمین لے جاتا ہے۔ جس کا قطعاً کوئی حصہ اس محنت میں شامل نہیں ہوتا اور زمین کی ہی اس آمدنی سے وہ پورے ملک میں سیاست یا بدکرداری کے ذریعے فساد پھیلاتا پھرتا ہے۔

اندھیروں میں ایک اندھیرا سودی نظام یا Capitalistic System بھی ہے۔ اس کے لئے

جس قدر کم کہا جائے' اس قدر اچھا ہے۔ قرآن کریم نے تو اس کو مذموم قرار دیا ہی تھا لیکن اب عام انسانی فکر بھی اس کی مذمت کرتا ہے۔ سارے اشتراکی ممالک اس کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے سبب اب بھی ساری دنیا میں اس ظلم کا اندھیرا ہے۔ سودی معاشرہ میں باہمی محبت' ہمدردی اور ایک دوسرے کی مصیبت کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے اور انسان مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآنی معاشرہ کے ابتدائی مراحل میں ہی غرباء کی ضرورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں سود کے ذریعے مزید غریب بنانے کے نظام کو ختم کر کے' صدقات کا نظام جاری فرمایا تھا۔ جو معاشرہ بھی سودی نظام کی بنیاد پر استوار ہوگا' اس میں ہمیشہ عدم اطمینان کی حالت رہے گی۔

اس کے علاوہ بھی آج کل جو معاشرتی عیوب ہیں اور جن کو قرآن کریم نے بالکل حرام قرار دیا ہے جیسے شراب نوشی' جوا' سٹہ' بدچلنی وغیرہ یہ سب ان معاشروں کے اندھیرے ہیں۔ ان میں سے ہر موضوع پر طلوع اسلام کے لٹریچر میں اس قدر تحریر کیا گیا ہے کہ یہاں ان کا اعادہ' قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔

روشن خیالی کے اندھیروں کا ذکر آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا۔ امریکہ کو آج تمام اقوام عالم کی امامت کا درجہ حاصل ہے اور اس کو یہ امامت صرف اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس نے ٹیکنالوجی پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ورنہ جس قوم میں Free sex اور ہم جنس پرستی Homosexuality جیسے شنیع وقبیح افعال کی اجازت ہو اس کی کیا تہذیب۔ وہاں Violence اور بدسیرتی کا رواج عام ہے۔ ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے Terror شروع کر کے' اپنے کو بدنام اور سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ ورنہ ہماری اقدار اس درجہ اچھی ہیں کہ اگر ان کو علمی و استدلالی طریقہ پر پیش کیا جائے تو ہر سنجیدہ اور نیک دل آدمی ان کو قبول کرے گا۔ کوئی شخص کتنا ہی بدچلن ہو لیکن وہ عفت وعصمت Chastity کو پسند کرے گا۔ ہر شراب خور' شراب خوری کو برا سمجھتا ہے۔ اگر امریکہ کے عوام کو اسلام کی مضبوط مستقل اقدار سے روشناس کرایا جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس کو پسند کریں۔ اسلام کا تعارف بطور ایک movement کے کرانا زیادہ سود مند ہے۔

اس سلسلہ میں امریکہ کا جو تذکرہ شروع کیا گیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ بلکہ اس مضمون کی تحریک بھی اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ ان موجودہ اندھیروں کے درمیان امریکہ میں ایک روشنی کی کرن نظر آتی ہے جس کا نوٹس لینا نہایت درجہ ضروری ہے۔ اس لئے اس روشنی کی کرن کا مختصر سا تعارف پیش خدمت عالی ہے جس کے لئے راقم سطور کی درخواست ہے کہ اس کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

امریکہ میں ایک شخص فرد محمد نام کا 1930ء میں کہیں سے آیا اور وہ 1934ء میں امریکہ سے واپس کہیں چلا گیا۔ اس شخص کے متعلق عام طور پر معلومات بہت کم ہیں۔ تاہم اس شخص نے امریکہ میں 1930ء میں اسلام کی بنیاد رکھ

دی اور کچھ کالے حبشی Negros جنہیں اب African American کہتے ہیں' کو مسلمان کر لیا۔ یہ مسلمان ہونے والے لوگ زیادہ تر جرائم پیشہ Criminals تھے کیونکہ فرد محمد نے جیل میں ہی جا کر تبلیغ کی تھی۔ ان مسلمان ہونے والوں میں ایک شخص Elijah Muhammad بھی تھا۔ یہ شخص بہت صلاحیتوں کا مالک اور بہت Potentialities والا تھا۔ اس نے امریکہ میں اسلام کی ترویج شروع کی چونکہ یہ شخص Born Administrator تھا اس لئے اس نے ایک جماعت Nation of Islam نام کی قائم کر دی۔ اس نے اس جماعت کے نام سے بہت بڑی جائیداد بھی خرید لی۔ یہ شخص 1975ء میں فوت ہوا۔ ایوب خاں کے دور میں پاکستان آیا اور ایوب خاں سے ملاقات بھی کی۔ Elijah کی زندگی میں ہی ایک اور شخص Malcom بھی مسلمان ہوا اور یہ Elijah سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا اور اس کو Overshadow کر گیا۔ نیشن آف اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد محمد خدا تھا اور علائی جاہ اس کا رسول تھا۔ یہ لوگ بائبل اور قرآن کریم دونوں کو حجت مانتے ہیں۔ ان کی تعداد اس وقت گیارہ ملین (ایک کروڑ دس لاکھ) ہے جبکہ امریکہ کی کل آبادی 28 کروڑ ہے۔ میلکم نے نیشن آف اسلام کے عقائد ترک کر دیئے۔ اس نے حج بھی کیا اور عام مسلمان عقائد اختیار کر لئے۔ اس کا تنازعہ علائی جاہ سے ہو گیا۔ کیونکہ علائی جاہ کے تعلقات اپنی پرائیویٹ سیکریٹری سے تھے' اس لئے Malcom X نے اس کو بہت بدنام کیا۔ بالآخر Malcom X کو کسی نے قتل کر دیا۔ نیشن آف اسلام والے کہتے ہیں کہ حکومت نے قتل کرایا ہے مگر حکومت کہتی ہے کہ علائی جاہ نے اس کو قتل کرایا ہے۔ علائی جاہ کی لائف پر کافی کتابیں لندن میں دستیاب ہیں اور Malcom X پر بھی بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میلکم X پر فلمیں بھی بنی ہیں جو پاکستان میں بھی دستیاب ہیں اور راقم سطور نے وہ دیکھی ہیں۔ نیشن آف اسلام کا ایک Final Call-Weekly کے نام سے امریکہ سے نکلتا ہے اور لندن میں Piccdilly میں اتوار کی شام کو اس پارٹی کے نوجوان بچے یہ رسالہ فروخت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس رسالہ کی قیمت ایک پاؤنڈ ہے اور اس سے اس جماعت کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا ویب سائٹ ایڈریس www.finalcall.com ہے۔ جو صاحبان اس میں دلچسپی رکھتے ہوں کمپیوٹر سے یہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لندن میں Brixton مشہور علاقہ ہے جہاں کالے رہتے ہیں اس علاقہ میں ان کی دو مساجد ہیں۔ ایک مسجد میں مجھ ناچیز نے بھی ایک تقریب میں شرکت کی۔ امریکہ سے ان کے ایک عالم Dennis Muhal نام کے آئے ہوئے تھے۔ وہ تقریر کر رہے تھے' عورتوں مردوں کا مشترکہ مجمع تھا۔ موضوع عصمت وعفت کی اہمیت اور کنبہ کی اہمیت تھا۔ یہ لوگ اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم کی رو سے یہ مسلمان نہیں ہیں۔ ان کا ان نظریات پر قائم ہونا اور ان کا پس منظر ایک طویل موضوع ہے جو اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتا۔ کمترین کو موقعہ ملا اور قارئین کی خواہش معلوم ہوئی تو اس

جماعت پر مفصل مضمون تحریر کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال صرف ضروری معلومات ضبطِ تحریر میں لائی جا رہی ہیں۔

نیشن آف اسلام کا ایک Splinter Group بھی ہے جو ان کے نظریات کا قائل نہیں ہے بلکہ ان کے نظریات عام مسلمانوں جیسے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ کسی حد تک تحریک طلوع اسلام کے خیالات کے حامی ہیں۔ یہ فرقہ صرف قرآن کو حجت جانتا ہے۔ روایات کا قائل نہیں ہے۔ عرب تمدن کو اسلام کا جزو نہیں سمجھتا۔ اس فرقہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

یہ لوگ مولوی یا مولانا کی جگہ امام کا لقب لکھتے ہیں۔ علائی جاہ محمد کے بیٹے امام W.W.Deen (جواب تقریباً 70 سال کے ہوں گے)۔ علائی جاہ کے بعد نیشن آف اسلام کے صدر مقرر ہوئے لیکن ان کو نیشن آف اسلام اور اپنے والد کے نظریات قطعاً پسند نہیں آئے اور وہ ہمارے جیسے مسلمان ہو گئے چونکہ ان کے نظریات نیشن آف اسلام سے مختلف ہو گئے اس لئے انہوں نے اس جماعت کی صدارت چھوڑ دی اور ان کی جگہ فراخان نے لے لی۔ آج کل اس کے صدر وہی Farrakhan ہیں۔ امام Deen کے ساتھ اور بھی کافی علماء ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں امام علاء الدین شہباز ہیں۔ یہ شکاگو میں رہتے ہیں اور اس پارٹی کا مرکز بھی شکاگو میں ہے۔ ان کی کتب New Mind Publication۔ New Jersy سے مل سکتی ہیں اور اور ان کی ویب سائٹ

www.newmindpublication.com

راقم سطور نے امام علاء الدین شہباز کی چند کتب پڑھی ہیں جو بہت عمدہ ہیں۔ ان لوگوں نے تفسیر بھی لکھی ہے لیکن وہ مجھے حاصل نہیں ہو سکی۔ میں عرصہ دراز سے اس جماعت کی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر 1995ء میں میری لندن میں ہی کسی کے ذریعے Leeroy Mohd سے ملاقات ہوئی۔ یہ جوان آدمی ہے اور بہت مخلص' اس نے مجھے امام شہباز کی کچھ کتب دیں۔ یہ خود نیشن آف اسلام کا ہے۔ میں نے لندن سے ہی امام موصوف کو خط لکھا اور چند روز میں ان کے اپنے ہاتھ کا تحریر کردہ خط مجھے مل گیا۔ یہ بھی تقریباً 75 سال کے بزرگ ہیں مگر صاحبِ تصنیف اور بہت باخبر۔ یہاں تک کہ انہیں تحریک طلوع اسلام کا علم تھا کیونکہ انہوں نے ڈاکٹر عبدالودود مرحوم کی کتاب Conspiracies Against Quran پڑھی ہوئی تھی۔ کمترین راقم سطور جب واپس پاکستان آیا تو فوراً ایک عریضہ امام موصوف کو ارسال کیا۔ جو دفتر طلوع اسلام میں ہی عزیز محترم حسین قیصرانی کی ہدایت کے مطابق اور ان کی نگرانی میں تحریر کیا گیا۔ اس میں ادارہ طلوع اسلام کا مفصل تعارف تحریر کیا گیا اور انہیں پیش کش کی گئی تھی کہ اگر انہیں کوئی اعتراض یا سوال اسلام کے متعلق موصول ہو اور وہ اس کے جواب میں مشکل محسوس کرتے ہوں تو ادارہ ہذا کو Refer کر دیں ہم انشاء اللہ مفصل جواب ارسال کریں گے۔ اس خط کے ساتھ انہیں طاہرہ کے نام خطوط انگلش اور دو اور کتب ارسال کی گئیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے Monogamy

اور Homosexuality نام کی اپنی تحریر کردہ دو کتابیں ارسال کیں۔عورتوں کے حقوق کے بارے میں ان کے اور طلوع اسلام کے ایک سے نظریات تھے۔اس لئے انہوں نے ان صفحات کی نشاندہی خود کر دی تھی اور یہ اجازت دی تھی کہ ان کی ان کتب کو جو بھی چاہے طبع کرا دے ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔امام موصوف نے ہمارے خط اور کتابوں سے بہت اچھا تاثر لیا اور یہ تحریر فرمایا کہ انہیں تحریک طلوع اسلام کا ہی ایک ممبر شمار کیا جائے اور یہ مطالبہ کیا کہ ادارہ جس قدر لٹریچر انہیں ارسال کرے گا' اسی قدر افراد وہ مسلمان کر لیں گے۔

اس ساری تفصیل کو اس لئے تحریر کیا گیا ہے کہ امریکہ کے پورے ملک جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے وہاں یہ ایک روشنی کی کرن موجود ہے۔کمترین راقم سطور کی ہر قاری سے درخواست ہے کہ وہ نیشن آف اسلام یا شکاگو کی مسلم جماعت سے رابطہ کریں۔ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کریں۔ان کے موجودہ حالات سے بھی آگاہ ہوں۔ان کا پورا لٹریچر حاصل کریں اور اس کا مطالعہ کریں۔خصوصاً ''نیشن آف اسلام کو اپنا Target بنائیں۔ان کو صحیح اسلام سے آگاہ کریں۔کمپیوٹر سے پورا فائدہ اٹھائیں اور نیشن آف اسلام کو صحیح اسلام پر لے آئیں ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔امریکہ حکومت سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو ایک الگ State دے دی جائے۔ Final Call میں ان کے مقاصد اور عقائد پہلے ہی صفحہ پر نمایاں لکھے ہوتے ہیں۔ان دونوں گروہوں سے ضرور رابطہ کریں اور ان کو فکری تقویت دیں۔کیا عجب کہ

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

والی صورت پیدا ہو جائے۔ختم نبوت کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن کی تبلیغ کرے۔حضورﷺ کا حکم بھی ہے کہ بلغوا عنی القرآن ولو کانت آیۃ مجھ سے قرآن حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

اگر اس سلسلہ میں مزید معلومات درکار ہوں تو اس ای میل پر کمترین سے رابطہ فرمائیں۔

azureabbas@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

غلام باری، مانچسٹر

اقامتِ الصلوٰۃ کا مطلب ومقصد

صلوٰۃ! قرآن کریم کی ایک بڑی اہم اور جامع اصطلاح ہے۔ **''اقیموا الصلوٰۃ''** کے حکم سے بعض آیات میں نماز پڑھنا اور بعض میں مقصد نظامِ الصلوٰۃ قائم کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز پڑھنا (نماز کا اجتماع) ایک بنیادی ذریعہ ہے نظامِ الصلوٰۃ کے قیام واستحکام کا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین، مکمل ترین اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اسے ''روحنا'' کہہ کر پکارا ہے)۔ یہ ذات، ذاتِ خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے جو اپنی صفات وحی کے ذریعے (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر (علیٰ حدِ بشریت) اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے) وہ ہے صراطِ مستقیم جس پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لیکن وحی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اقامتِ الصلوٰۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ **اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ** کریں گے (22/41)۔ یعنی اسلامی مملکت صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین اور اس سے ملحقہ علاقہ کے انتظام کو اپنے بیٹے اسحٰقؑ کے حوالے کر کے، خدائی مملکت کی توسیع اور استحکام کے لئے دوسرے بیٹے اسمٰعیلؑ کو ساتھ لے کر مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں خدا کا پہلا گھر کعبہ (دین کا مرکز) تعمیر کر کے بارگاہ رب العزت میں عرض کی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصدِ عظیم کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو تیرے واجب الاحترام

گھر کے پاس لاکر بسا دیا (اسے تیرا گھر اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہوکر عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے) یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام ونشان نہیں۔ میں نے یہ سب اہتمام اس لئے کیا ہے تاکہ میری اولاد **"لیقیموا الصلوٰۃ"** نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرے یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں (14/37)۔ قومِ مدین نے کہا کہ اے شعیبؑ کیا تیری الصلوٰۃ تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقۂ پرستش کو چھوڑ دیں اور یہ کہ اپنا مال بھی اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں (11/87)۔ اس آیت سے بھی صلوٰۃ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ سورۃ المومنون کی آیت 9 میں مومنین کی خصوصیت صلوٰۃ کی محافظت بتائی گئی ہے۔ سورۃ مریم میں انبیاءؑ کے متعلق ہے کہ انہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا لیکن ان کے بعد، ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انہوں نے صلوٰۃ (نظامِ الصلوٰۃ) کو ضائع کر دیا اور اپنے اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے (19/59)۔ (یہ ہماری حالت ہے) کتاب اللہ کے بعض حصہ پر عمل کرنے اور بعض سے انکار کرنے یا اسے چھپانے والی قوم کی حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہوتی ہے اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہیوں سے لبریز۔ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی (2/85)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

انشاءاللہ

اپنے کسی معاصر کی صلاحیتوں کا اعتراف مشکل کاموں میں سے ایک ہے اور اگر وہ ہم عصر ہم عمر ہو تو مذکورہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ قارئین آگاہ ہیں بلکہ گواہ ہیں کہ ہم نے ہمیشہ اپنے معاصر ''زیرو پوائنٹ'' والے جاوید چودھری کے لئے کلماتِ تحسین ہی لکھے ہیں' بلاشبہ وہ تعریف کے جائز حق دار ہیں کہ انہوں نے اک زمانہ بڑی جرأت کے ساتھ کلمۂ حق کہا' جی ہاں جابر سلطان کے سامنے' پھر ان کا منظر نامہ + بیانہ + طرزِ تحریر اتنا دلنشیں ہوتا ہے کہ اسے ایک عمدہ افسانے کی متعدد دلکشیوں سے مزین قرار دیا جاسکتا ہے۔ ویسے ہم نہیں جانتے کہ نسلِ نو کے اس سب سے اہم کالم نگار کے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے کہ ملک جب سے مشرف بہ پرویز ہوا ہے' جاوید صاحب کے ہاں وہ بانکپن نہیں رہا۔ ؎

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں' نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی' نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

خیر بندہ بشر ہے' سو مجبوریاں' ہزار مسئلے مسائل ہوا کرتے ہیں' گفتنی بھی ناگفتنی بھی۔ غالباً کسی مجبوری کی وجہ سے ہی ہمارے مذکورہ ممدوح عقیدۂ جبر کے مبلغ بن گئے ہیں جس کی ایک مثال 23 ستمبر 2004ء کے روزنامہ ''جنگ'' میں چھپنے والا ان کا کالم ''انشاءاللہ'' ہے۔ آج ہم ان کے اس کالم کے حوالے سے دو ایک باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں؟ ''ٹی وی خبرنامہ..... میں موسم کی پیش گوئی کرنے والی خاتون یا صاحب بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں آئندہ چوبیس گھنٹوں میں فلاں فلاں علاقے میں بارش ہوگی اور فلاں فلاں جگہ پر موسم خشک رہے گا۔ میں جب بھی یہ سنتا ہوں میرے دل میں خواہش انگڑائی لیتی ہے' کاش یہ اس کے ساتھ انشاءاللہ کہہ دیتے تو پیش گوئی' پیش گوئی نہ رہتی دعا بن جاتی اس میں برکت آجاتی..... اسی طرح اگر ریلوے' پی آئی اے اور پرائیویٹ بس سروسز کی انکوائری میں بھی انشاءاللہ کا اضافہ ہو جائے' اگر آپ ریلوے انکوائری فون کریں ان سے پوچھیں' ریل کا رکب پہنچے گی اور وہ جواب میں فرمائیں انشاءاللہ ریل کار وقت پر پہنچ جائے گی۔ یہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی ہوگی۔ اگر ہم ریسکیو 15' فائر برگیڈ اور ایمبولینس سروس کے عملے کو بھی ''انشاءاللہ'' کی ٹریننگ دے دیں' وہ ہنگامی کال کے جواب میں فرمائیں' ہم

انشاء اللہ چند منٹوں میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں' تو اس سے دلوں کو بہت تسکین پہنچے گی' اسی طرح اگر ہم دفتروں کے نظام اوقات کے ساتھ انشاء اللہ لکھوا دیں' جج صاحب سائل کو تاریخ دیتے وقت انشاء اللہ کہہ دیں' ڈاکٹر صاحب مریض کے لئے دوا لکھتے ہوئے' موٹر مکینک مالک کو گاڑی واپس کرتے ہوئے اور ٹیکسی ڈرائیور سواری کو منزل مقصود تک پہنچانے کا وعدہ کرتے ہوئے انشاء اللہ کہہ دے تو ان لوگوں کے کام میں اللہ کی رضا اور مدد شامل ہو جائے گی۔''

صاحبو! مکرم جاوید چوہدری کے نقطۂ نظر پر ہم اپنے تحفظات کا اظہار بعد میں کریں گے' پہلے آپ ایک مزے کی بات سن لیں۔ ہمارے تبلیغی جماعت والے بی بے اور میٹھے میٹھے بھائی اپنا پیغام لے کر کسی کے پاس گئے' اپنا کل عندیہ گوش گزار کرنے کے بعد اس زیر تبلیغ سے کہا: آج فلاں مسجد میں مغرب کے بعد بیان ہو گا' تشریف لائیے گا؟ وہ صاحب کہہ بیٹھے ''انشاء اللہ''۔ اب تبلیغی گروہ میں شامل ایک ذہین ساتھی غالباً ان کی نیت بھانپ کر برجستہ بول اٹھے: ''دیکھئے صاحب! انشاء اللہ کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا مکمل ارادہ ہے اگر اللہ نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔ دوسرا یہ کہ میرا تو بالکل سرے سے کوئی ارادہ نہیں' اگر اللہ نے ایسا چاہا تو مجبوری بن جائے گی آنا ہی پڑے گا۔ کہئے آپ کا کیا ''ارادہ'' ہے؟

دوستو! اب ہم جاوید چوہدری صاحب سے بے حد سادہ' ہر پیچ' ہر باریکی اور ہر فلسفے سے ہٹ کر یہ استفسار کرتے ہیں کہ اگر ریل کار کا ڈرائیور یہ کہتا ہے کہ میں شام چار بجے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا' انشاء اللہ! اور وہ اپنی غفلت کی وجہ سے گاڑی اتنی لیٹ کر دیتا ہے کہ وہ اگلے روز چار بجے شام پہنچتی ہے' جب آپ اس کا محاسبہ کریں کہ میاں یہ تم نے کیا کیا؟ تو وہ کہے جناب! میں نے کہا تھا انشاء اللہ' اب اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا تو جا کر اس سے پوچھیں' میرے ساتھ سوال جواب کر کے اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ تو ہمارے فاضل کالم نگار کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

باقی رہیں اس کلمے کے استعمال سے برکات کی شمولیت' تو معذرت کے ساتھ اس تکیہ کلام کا سب سے زیادہ استعمال ہمارے حکمران اور سیاستدان کرتے ہیں۔ ''ہم اقتدار میں آ کر انشاء اللہ اس ملک کی حالت یکسر تبدیل کر دیں گے' ہم انشاء اللہ اسلامی نظام نافذ کریں گے' ہم انشاء اللہ غربت' بدامنی' دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے.....!'' اب ہوتا کیا ہے وہ انشائیے اقتدار میں آ جاتے ہیں' مگر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں' نہ غربت میں کمی ہوتی ہے' نہ امن و امان کی صورتحال میں کوئی مثبت تغیر رونما ہوتا ہے' نہ دہشت گرد اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان دعاوی کرنے والوں سے پوچھا جائے' کیوں بھئی یہ سب کیا ہے؟ تو وہ پولے سے منہ سے یہ جواب دے دیں کہ اے معترضو! ہم نے کہا تھا انشاء اللہ۔ اب اگر اللہ کی مرضی ہی نہیں تھی تو ہماری کوششیں بے ثمر ہی رہنی تھیں' چنانچہ نکتہ چینو! یہ تم ہم پر زبانِ طعن دراز کر رہے ہو یا اللہ میاں پر؟ ہم نہیں جانتے جاوید چوہدری صاحب اس کا کیا جواب ارشاد فرمائیں گے؟

اور آگے بڑھئے ایک آدمی پورے عزم کے ساتھ یہ کہتا ہے' انشاء اللہ میں رشوت خوری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ

دوں گا۔ اور وہ اپنے اس دعوے میں ''صادق'' ثابت ہوتا ہے تو اب اس کا کریڈٹ کس کو جائے گا؟ کون اس صورتحال کا ذمہ دار ہوگا؟ ڈاکٹر کہتا ہے انشاء اللہ میری دوا سے مریض صحت یاب ہو جائے گا' اب اپنے بغلی میڈیکل سٹور سے وہ جعلی دوا نکال کر مریض کو تھما دیتا ہے' جب مریض اگلے جہان سیاحت پر روانہ ہو جائے اور ورثاء ڈاکٹر سے پوچھیں حضرت آپ کی دوا سے مریض تو مر گیا' اس پر وہ ڈاکٹر طیش میں آ کر کہے: ''او کافرو! میں نے انشاء اللہ کہا تھا۔ اللہ کی مرضی پر معترض ہوتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو فرمایئے کیا کہا جائے گا بیچ اس مسئلہ کے؟

یہاں جب انشاء اللہ کے مروج جواز کی غار ریسکیو 15 والوں کو فراہم کر دی جائے گی تو وہ کتنی آسانی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈال لیں گے۔ یہی سائبان جب فائر برگیڈ والوں کے سروں پر تان دیا جائے گا تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ آگ نہ بجھانے کا الزام اپنے سر لیں۔ ایمبولینس والے کی جب جیب گرم نہیں کی جائے گی تو وہ مریض کی خواری یا میت کی رسوائی پر سیدھا سادا جواب دے کر فارغ ہو جائے گا'' ''میرے مولا کی یہی مرضی تھی''۔

خدارا موسم کی پیش گوئی کرنے والوں کو اپنے علم' مشاہدے اور آلات پر اعتماد کرنے دیں تاکہ ان کی نشر کردہ اطلاعات پر ناظرین و سامعین کو بھی یقین آ سکے ورنہ 'انشاء اللہ' کہہ کر تو ایک لمحے میں ان کی ''چھٹی'' ہو جائے گی اور یہاں ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے جاری ہونے والی خبریں' اطلاعات ہوتی ہیں' دعائیں نہیں۔ اب اگر جاوید چوہدری صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے نیوز کاسٹر کے حسین لبوں سے یہ پھول جھڑیں کل انشاء اللہ جنوبی پنجاب میں شدید طوفان آئے گا۔ پشاور اور سرحد کے بالائی علاقوں میں انشاء اللہ زلزلے کے زبردست جھٹکے محسوس ہوں گے۔ فلاں پہاڑ میں انشاء اللہ تباہ کن آتش فشاں پھٹے گا۔ آج رات انشاء اللہ ایک سمندری طوفان ساحلی علاقوں کو غرقاب کر دے گا۔ گوادر میں انشاء اللہ آسمانی بجلی گرے گی' جیکب آباد میں انشاء اللہ تیز رفتار بگولوں سے تاریخی بربادی ہو گی..... وغیرہ وغیرہ تو پلیز بتایئے ان دعائیہ خبروں سے خلق خدا کو کتنے نفلوں کا ثواب ہوگا؟ اس جہت پر غور کیوں نہیں کیا جاتا کہ بارشیں ہوں یا آندھیاں' موسموں کی خشکی ہو یا تری' ہواؤں کے دباؤ میں کمی ہو یا بیشی' درجۂ حرارت کا بڑھنا ہو یا گھٹنا..... یہ سارے عوامل کسی کے لئے مفید ہوتے ہیں اور کسی کے لئے مضر۔ اب جس کی فصل پک کر تیار کھڑی ہے اسے یہ بشارت سنانی کہ انشاء اللہ کل سہ پہر ژالہ باری سے سب برابر ہو جائے گا۔ وہ متاثرہ کسان اس ''دعا'' پر ٹی وی والوں کو کیا گولڈ میڈل پیش کرے گا؟ اگر خبروں کو حصولِ برکات کی مقدس غرض سے مناجات یا دعائیں بنانا ہے تو پھر خبر کا متن یوں ترتیب پائے گا۔ 'جن لوگوں کو بارش کی ضرورت ہے' کل ان کے لئے انشاء اللہ ابرِ کرم کھل کر برسے گا اور جنہیں بارش کی ضرورت نہیں انشاء اللہ وہ سب بارش کی تعذیب سے محفوظ رہیں گے۔'

بھئی یہ بڑی سیدھی سی بات ہے چاند گرہن لگنا ہے یا سورج گرہن' موسم میں کوئی تغیر رونما ہونا ہے یا زلزلہ آتا ہے..... ان سب طبعی عوامل کی بابت تو موجودہ سائنسی علوم کی

روشنی میں عوام الناس کو صرف اور صرف خبر/ اطلاع پہنچانا مقصود ہوتا ہے تا کہ فطرت کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے انسان اپنا لائحہ عمل تیار کرے اور اس کے مضرات سے مامون رہ سکے اور اگر وہ تبدیلی اس کے لئے فائدہ مند ہے تو بھرپور طریقے سے اس سے استفادہ کر سکے۔

جاوید چوہدری صاحب! یہ پیاسی قوم پہلے ہی انصاف کے پانی کے لئے برسوں سے تڑپ رہی ہے اس ترسی ہوئی قوم پر رحم کیجئے' جج صاحب کو پوری منصبی ذمہ داری کے ساتھ سائل کو تاریخ دینے دیجئے' اگر انشاءاللہ کے مروج مفہوم کے ساتھ تاریخ دی جائے گی تو معینہ تاریخ کو جج صاحب ضمیر کے ہر بوجھ سے آزاد ہو کر ساحلِ سمندر پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ پکنک منا رہے ہوں گے اور سائل بے چارہ عدالتوں میں دھکے کھا رہا ہوگا اور اسے سارا دن بٹھا بٹھا کر سوا تین بجے ریڈرنئی تاریخ دے رہا ہوگا غالباً انشاءاللہ کہہ کر۔ ذرا سوچئے ججوں اور ریڈروں کو بھی کہیں جوابدہ کرنا ہے یا انشاءاللہ کے ذریعے انکو کھلی چھٹی دے دینی ہے؟

یہ سب ہم اس لئے زور دے کر عرض کر رہے ہیں کہ سماج کا کوئی فرد خود کو احتساب سے بالا نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر اس سے کچھ اچھا بن آتا ہے تو وہی انعام کا مستحق ہے' اگر اس سے کوئی کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو وہی عقوبت کا سزاوار ہے۔ دوسری صورت میں تو نہ وہ شاباش کا استحقاق رکھتا ہے نہ اس پر کوئی حد جاری کی جا سکتی ہے کہ ''کرنے والا'' تو کوئی اور ہے۔ واضح رہے یہاں یہ استدلال قائم کرنا بالکل بے معنی ہوگا کہ انشاءاللہ کہہ کر اگر کوئی جان بوجھ کر بدعملی کرتا ہے تو وہ خود ذمہ دار ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ۔ اس لئے کہ انشاءاللہ کا تو مطلب ہی یہ بتایا جاتا ہے' ''اگر اللہ نے چاہا تو''۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کچھ اللہ کے چاہنے کے بغیر ہو جائے خاص طور پر جب کام سے پہلے فاعل بالصراحت یہ کہہ چکا ہو انشاءاللہ۔ ظاہر بات ہے جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے' بندے کی تو کوئی مرضی ہوتی ہی نہیں۔ کیا کہا ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو پھر انشاءاللہ کی ادائیگی کیا محض رسم ہے؟ اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہوگی کہ مرضی بندے کی ہو' ذمہ دار وہ خود ہو اور زبان سے کہا جائے اللہ کی مرضی۔ کیا بندے سے مراد اللہ ہے یا اللہ سے مراد بندہ ہے؟ اس پیچ میں سے ہمارے صوفی بھائی ہی نکل سکتے ہیں کہ ان کے پاس وحدۃ الوجود کی صورت میں بڑی خاص ترکیب موجود ہے جو اس نوعیت کے ہر مسئلے کا بہترین حل ہے۔

اس سلسلے کو کوئی جتنا چاہے طول دے لے' بنیادی سوال وہی ہے کہ انسان کے اعمال کا ذمہ دار خدا ہے یا انسان خود ہے؟ اگر روایتی انداز میں سوچنا ہے تو پھر آج سے بلکہ ابھی سے تمام انسانوں کو بے خطا اور بے قصور قرار دے کر جزا سزا کے ہر عمل سے اسے بری کر دیں۔ دنیا میں انصاف پہنچانے والے جملہ اداروں پر تالے لگوا دیں اور آخرت میں جنت جہنم ایسے وقیع مقامات کو بھی فی الفور بے فائدہ کہہ ڈالیں۔ عراق میں مسلمانوں پر بش مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے تو اس میں بھی یقیناً اللہ کی مرضی شامل ہوگی۔ یہاں جن غاصبوں نے مخلوق خدا کا جینا حرام کر رکھا ہے تو ان محترموں کے عقب میں بھی پھر اس عظیم خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہوگا۔ یادش بخیر ماضی قریب میں ایک مطلق العنان ''بادشاہ'' اس قوم کو

''عطا'' ہوئے تھے انہوں نے فرمایا تھا نوے دن میں الیکشن کروا کے انشاء اللہ فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ پھر ''اللہ'' نے یہ چاہا کہ گیارہ برس اسی طرح بیت جائیں اور چشمِ تماشا نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا اور وہ صاحب آنجہانی ہو گئے مگر وردی اتارنا پسند نہیں کیا۔ اوپر والے کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہمارے فیورٹ رائٹر اور سپیکر مرحوم اشفاق احمد نے بھی اس دور میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قوم کو دن رات یہی سبق ذہن نشین کروایا کہ جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے' مقبول مومن وہی ہے جو چوں چرا نہ کرے اور راضی برضا رہے۔ ہمارا ایک دم بے طرح جی چاہا کہ موجودہ مقتدر کی بارگاہ میں عرض کریں کہ وہ بلا تاخیر قوم سے صرف ایک جملے پر مشتمل خطاب فرمائیں اور اسے مژدہ سنائیں' ''میں بہت جلد وردی اتار دوں گا انشاء اللہ''! بس اس کے بعد خاموش ہو جائیں۔ پھر دیکھیں خدا کیا کرتا ہے؟ ساری قوم کو بالعموم چپ لگ جائے گی' بالخصوص ہمارے ایم ایم اے کے قائدین کا تو ہمیشہ کے لئے منہ بند ہو جائے گا۔ ہمارا نہیں خیال ہمارے یہ مذہبی رہنما ''خدا'' کے فیصلوں پر کبھی اعتراض کریں گے۔

جاوید بھائی! چلتے چلتے ایک صراحت اور کر دیں اب تک جس غربت' ناانصافی اور لاقانونیت پر آپ اپنے سینکڑوں کالموں میں صدائے احتجاج بلند کر چکے ہیں' ذرا تحمل کے ساتھ بتائیے اس واویلے کی کیا ضرورت تھی؟ جب سب کچھ اسی اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے؟ ممکن ہے اس کے جواب میں مکتب کے ملا کی طرح آپ بھی یہی ارشاد فرمائیں کہ ناانصافیاں بھی اللہ کے حکم سے ہو رہی ہیں اور ان ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی اللہ کے حکم کے تحت اٹھائی جا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں اس جواب پر ہم لاجواب ہو جائیں گے۔

ارے نہیں صاحب! خدانکردہ ہم خدا کے منکر نہیں ہیں' نہ اس کے قادرِ مطلق ہونے کے بارے ہمیں کوئی شک و شبہ ہے۔ ہمیں تو بس اس عظیم و رحیم خدا پر لگنے والے الزام کا دفاع کرنا ہے کہ وہ ہستی متذکرہ تہمتوں سے یکسر پاک ہے۔ اس نے خود اپنی مرضی' خالص اپنے اختیار سے انسانوں کو بااختیار بنایا ہے اور اس کے بااختیار اور قدیر و قادر ہونے کی ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ کوئی بے اختیار دوسرے کو بااختیار نہیں بنا سکتا' بااختیار وہی بنا سکتا ہے جو خود بااختیار ہو۔ جی ہاں اسی بااختیار اور بزرگ و برتر خدا نے اپنی آخری کتاب میں دوٹوک الفاظ میں فرما دیا ہے۔

''ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آ گیا ہے
اب جس کا جی چاہے قبول کر لے' جس کا جی چاہے
اس سے انکار کر دے۔''

''انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔''

''جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے' وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

ایک مقام پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے پوری نسلِ انسانی کو جھنجھوڑا گیا ہے۔

''ان کی تباہی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔''

اسی طرح خدا کے قوانین میں ملاوٹ کرنے والے بددیانتوں کی قوم کو یہ وعید سنائی گئی۔

''کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل وخوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس پر اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائے گا۔''

اس مضمون کی قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں' عاد وثمود سے لے کر ابرہہ وابولہب تک کتنے ہی کردار اور کتنے ہی مقام آئے ہیں جہاں قدم قدم پر ہر انسان کو یاد کروایا گیا ہے کہ میرے قوانین کی نافرمانی کا لازمی نتیجہ تمہیں بھگتنا ہوگا' انسان ہی اپنے اعمال وافعال کا مکمل ذمہ دار ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ''اللہ کی مداخلت'' کا کیا کوئی جواز رہ جاتا ہے؟

قصہ تو بس اتنا ہے کہ جب قوموں کی گھٹی میں غلامی کی خُو رچ بس جاتی ہے تو وہ اپنے عملوں کا ذمہ دار اپنی بجائے اپنے رب کو قرار دے کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ ظاہر و باہر ہے کہ اس آئیڈیل صورتحال کا سب سے زیادہ فائدہ ''خداوندانِ اقتدار'' کو پہنچتا ہے' سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے' مذہبی پیشواؤں کو پہنچتا ہے۔ عوام بلکہ رعایا راضی برضا ہو جاتے ہیں کہ یہ مقتدر ہم پر اس وقت تک قابض رہیں گے جب تک اوپر والا چاہے گا' امراء تب تلک چھینا جھپٹی سے اکٹھی کی گئی دولت سے آسائشیں خریدتے رہیں گے جب تک ان کو اجازت دینے والا چاہے گا اور ہم عوام تب تک زمین کے سینے سے چمٹے کیڑوں کی طرح برابر رینگتے رہیں گے جب تک ''اس'' کی مرضی ہوگی۔

خدارا' خدا سے وہ بات تو منسوب نہ کریں جو اس نے کبھی کی نہیں اگر اس خالق اعظم سے دل میں معمولی سا بھی لگاؤ ہے تو اس کے اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

جزاء بما کانوا یعملولون

یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔

پیارے قارئین! بات ادھوری رہ جائے گی' اگر یہ تصریح نہ کی گئی' پھر ''انشاءاللہ'' کا حکم کیوں آیا ہے؟ انشاءاللہ کہے بغیر انسان/مسلمان کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ واضح سی بات ہے ''انشاء اللہ'' کے کچھ ایسے معانی ہوں گے جو متذکرہ صدر نصوص کے موید ہوں ورنہ خاکم بدہن قرآن کو متضاد احکامات کا مجموعہ تسلیم کرنا پڑے گا' نیز مجبوراً ناسخ ومنسوخ ایسے لایعنی حیلے تراشنے پڑیں گے۔ روایتوں کو آیتوں پر ترجیح دینی پڑے گی۔

ضروری ہو گیا ہے کہ اس مرحلے میں سورۃ کہف کی ان آیات کا ترجمہ نقل کیا جائے جس کو بطور حوالہ جاوید چوہدری صاحب نے اپنے کالم میں درج کر کے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

''اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ لینا اور اگر بھول جاؤ تو جب یاد آ جائے اس وقت کہہ لینا اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کے قریب کرے گا۔''

اب ہمارے مکرم حبیب جاوید چوہدری نے نادانستگی میں وہی کام کیا ہے جو عصرِ حاضر کے ننانوے فی صد علماء کر رہے ہیں کہ قرآن کی آیت کو کسی روایت کے ساتھ بریکٹ کر کے تفہیم کی راہیں متعین کرتے ہیں' چاہے اس سعی میں قرآن مجید کے احکامات آپس میں متصادم ہو کر ہنگامہ برپا

کر دیں' پروا نہیں۔ اس فارمولے کو لگانے سے پہلے اگر ذہن میں یہ نکتہ رکھ لیا جائے کہ آیات کی پوزیشن قطعی' حتمی اور یقینی ہے' الفاظ کی حد تک' متن کی حد تک اس وادی میں سے تشکیک وارتیاب کی چیونٹی بھی گزر نہیں سکتی جبکہ روایات کو آپ آیات کی طرح ہر التباس سے منزہ کسی طرح قرار نہیں دے سکتے کہ بہر حال قرآن کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے' روایات کے تحفظ کا وہ ضامن نہیں ہے۔ بے شک اکثریت نے خوش نیتی سے اس ذخیرے کو جمع کیا ہوگا مگر دو تین صدیاں بیچ میں حائل ہونے کے سبب آمیزشیں ہوئی ہوں گی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جامعین نے قریب قریب اسی فی صد روایات کو مسترد کر کے باقی کو رکھا ہے اور جو ہے اس کے متعلق بھی مکمل یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کی صحت ہر شبہ سے بالا ہے۔

اس تناظر میں وہ روایات بطور خاص بڑی ہی احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں جن میں خاتم الانبیاء حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہمائش کے پہلو برآمد ہوتے ہوں۔ پھر ان روایات کی سیڑھی استعمال کر کے ان آیات کی یوں تفسیر کی جائے کہ اس عظیم اور پاکیزہ ہستی کو کٹہرے میں کھڑا کر کے جرح کی جائے۔ ایک نہیں کئی آیات ایسی ہیں اگر روایات کے پس منظر سے جدا کر کے دیکھی جائیں تو خالص قرآنی سیاق و سباق میں وہ عظمت نبویؐ کی روشن شہادت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں جبکہ دوسرے زاویے یعنی ''روایتی اندازِ نظر'' سے انہیں دیکھا جائے تو آپؐ کی شخصیت کا اور ہی رنگ سامنے آتا ہے۔ ہماری رائے میں حضورﷺ کی شخصیت کا تقدس سب پر مقدم ہے کیونکہ آپؐ کی ذات کے سرفراز ہونے کا شاہد خود رب کریم ہے۔ قرآن صاحب قرآن کی سیرت کو جس طرح پیش کرتا ہے' وہی قابل قبول ہونی چاہئے' اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہئے نہ کہ ''اپنے'' اور ''غیر'' مؤرخین کی تقلید میں آپؐ کے مرتبے کا تعین کر کے سوئے ادب کا مرتکب ہونا چاہئے۔

اب پہلی بات تو یہ ہے کہ سورۃ کہف کی 24,23 نمبر محولہ آیات میں پس منظر کہیں بیان نہیں ہوا جس کو جاوید صاحب نے بطور اساس کے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ ہاں آپؐ کی وساطت سے پوری امت کو ایک خوبصورت سبق ضرور ذہن نشین کروایا گیا ہے کہ ''انشاء اللہ'' کہا کرو۔ یقیناً اللہ کا یہ حکم بھی غیر معمولی حکمت کا حامل ہوگا' شعور کی اس جہت کا ہر زاویہ لازماً حیران کن نور سے معمور ہوگا اور قرآن کے مرکزی نکتے کو مضبوطی اور پختگی عطا کرنے والا ہوگا یعنی ذہن انسانی کو قانون ربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش سے بھرپور ہوگا۔

صد افسوس فاضل کالم نویس نے اپنی تحریر میں ''انشاء اللہ'' کو اسی مفہوم کا لبادہ پہنایا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا' اگر اللہ کی مرضی ہوئی یعنی بندے کی مرضی چل نہیں سکتی' چلے گی تو اللہ کی مرضی چلے گی۔ انہیں یہی کہنا چاہئے تھا کہ عام طور پر ''ان'' کا ترجمہ ''اگر'' ہی کیا جاتا ہے اور ''شـــاء'' کو عموماً ''چاہنے'' سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے اور ''اللہ'' کو ساتھ ملا کر ترجمانی یوں کر دی جاتی ہے' ''اگر اللہ نے چاہا تو.....'' یہ عمل کرنے کو تو کر دیا جاتا ہے لیکن اس طرف کوئی غور نہیں کرتا کہ اس طرح قرآن حکیم کے مجموعی نظام فکر کی عمارت میں جو

دراڑیں پڑتی ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے؟

قرآن مجید سے سچا اور خالص عشق رکھنے والوں نے ''شـــاء'' کا اس مقام پر ترجمہ لغت کی رو سے ''مشیت'' یا ''قانونِ مشیت'' کر کے اللہ کے دین کی آبرو بچالی ہے۔ اللہ کا نظامِ رحمت ایسے مخلصین پر اپنے لطف و کرم کی مسلسل پھوار سے گلاب کے ارغواں پھول کھلائے۔ سنئے ان میں سے ایک ایسے فیض رساں، ممتاز اور عظیم مفکر قرآن کے زندہ الفاظ کی تلخیص

''['ان' کے ایک اور معنی بھی ہیں جنہیں بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآنِ مجید میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی رو سے کہا جائے گا کہ یہ حرف، تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی جس مفہوم کے لئے ہم اردو زبان میں 'چونکہ' استعمال کرتے ہیں، عربی زبان میں ان معانی کے لئے 'ان' بھی آتا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ 'ان' کے ان معانی کی رو سے دیکھئے کہ انشاء اللہ کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے..... کتب لغت میں ہے 'ان' بمعنی 'اذ' بھی آتا ہے۔ جس کا ترجمہ 'جب' ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وہی انشاء اللہ جو فقدان یقین اور عدم خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا۔ اب حتم و یقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے انشاء اللہ کا قرآنی مفہوم۔

سیوطی نے ان بمعنی ''چونکہ'' یا ''جب'' کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں، مثلاً سورۃ آل عمران کی مشہور آیت

وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

چونکہ تم مومن ہو اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے۔

سورۃ فتح میں ہے

لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین

چونکہ تمہارا پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے۔ اس لئے تم ضرور امن و عافیت سے کعبہ (یا مکہ) میں داخل ہو گے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہل خاندان مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا

قال ادخلوا مصر ان شاء اللہ امنین

چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے تم مصر میں امن اور آرام سے رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے حضرت موسیٰؑ سے زندگی کا اہم معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ

سجدنی۔ انشاء اللہ من الصلحین۔

چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند ہوں اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں سے پاؤ گے۔]

اس علمی صراحت کے بعد سورۃ کہف کی آیات 23 اور 24 کا

مفہوم کچھ اس طرح سامنے آئے گا۔

''یہ غیب کے علم کی باتیں ہیں انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غیب کے سلسلہ میں انسان کی یہ حالت ہے کہ کسی دوسرے کے متعلق تو ایک طرف وہ خود اپنے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میں کل ایسا ضرور کروں گا۔ انسان جس کام کا ارادہ کرتا ہے اگر اس کے لئے وہ تمام اسباب و ذرائع جمع ہو جائیں جو اس کامیابی کے لئے ازروئے قانون خداوندی ضروری ہیں تو پھر وہ ارادہ پورا ہوسکتا ہے۔ اس لئے ارادہ کرنے کے بعد انسان کی توجہ ان اسباب و ذرائع کے مہیا کرنے پر مرکوز ہونی چاہئے۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی کڑی بھول جائے اور اس طرح اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس سے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی یا تاخیر ہو رہی ہے' اگر یوں متعلقہ قوانین کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا قریب تر راستہ سامنے آ سکتا ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر یہی کہنا چاہئے کہ مقصد پیشِ نظر کے حصول کے لئے قانونِ خداوندی کی رو سے جن اسباب و علل کی ضرورت ہے' اگر مہیا ہو گئے تو پھر یہ کام ہو جائے گا۔''
(ماخوذ۔ مفہوم القرآن' جلد دوم)۔

نتیجہ اس ساری گفتگو سے یہی نکلتا ہے کہ انسان کے سامنے بالعموم دو طرح کے معاملات ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کے متعلق وہ اپنے تجربے' علم اور مشاہدے کے بعد قریب قریب نہیں بالکل قطعی نتیجے پر پہنچ چکا ہے' مثلاً سادہ سی بات ہے اسے معلوم ہے کہ سورج نامی ایک چیز اس کے نظامِ شمسی سے وابستہ ہے اور یہ ستارہ زمین کے حوالے سے طلوع و غروب کا ایک سسٹم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے ظاہر ہونے اور چھپنے کے متعلق وہ کسی تذبذب کا شکار نہیں ہوگا اور کامل حتم و یقین کے ساتھ کہہ دے گا کہ کل فلاں خطے میں اتنے بج کر اتنے منٹ پر سورج نکلے گا۔ یا اس وقت پاکستان میں یہ وقت ہوا ہے' سورج اس پوزیشن میں ہے اور عین اس وقت امریکہ میں ان ہر دو حوالوں سے صورتحال یہ ہے اور یہ سب انفرمیشن اس نے قانون خداوندی کے بغور مشاہدے سے حاصل کی ہے۔ اب یہی بات جب وہ انشاءاللہ کے اضافے کے ساتھ کہے گا تو اس کی مراد یہ ہوگی' چونکہ اصولِ ربانی یہی ہے اس لئے ایسا ہی ہو گا۔ رہی وہ باتیں جن کے بارے ابھی اسے پوری طرح علم نہیں' معلومات ناقص ہیں' تجربات خام ہیں' مشاہدات پختگی کے مراحل طے نہیں کر پائے' عقل کو مکمل طور پر بروئے کار نہیں لا سکا تو اس کی انشاء اللہ کہنے کے پیچھے ایک غیر متزلزل عزم کارفرما ہوگا کہ میں اس شے کی بابت قوانینِ خداوندی کی پیہم اتباع کرتے ہوئے ایک دن ضرور ادراک حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کی لم اور کنہ لازماً میری دسترس میں آ کر رہیں گی۔ ہاں اسباب کو بائی پاس کر کے ایک ایجنسی چیز کی حقیقت کو طرفۃ العین میں منکشف کر سکتی ہے اور وہ ہے وحی آسمانی لیکن ایک تو وہ خالص موہبت الٰہی ہے کسی اکتساب کو آزما کر اللہ سے رابطے استوار نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کے بعد وحی تو کیا اس کے کسی مترادف نام سے بھی خدا اور

بندے کے بیچ ''مکالمہ ومخاطبہ'' نہیں ہوسکتا اور ختمِ نبوت کا یہی قرآنی مفہوم ہے۔ ہاں خوش قسمتی سے مومنین + متقین کے لئے اللہ کی آخری وحی اپنی مکمل حالت میں آج بھی قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ گہرے تدبر اور پورے اخلاص کے ساتھ اگر اس مجموعے سے رشتہ قائم کر کے رہنما اصولوں کی روشنی میں کائناتی قوتوں کو اسیر اور تسخیر کر لیا جائے تو ہزاروں اسرار آج بھی بے نقاب ہونے کو تیار ہیں۔ اور یہ جذبہ' یہ ارادہ انشاء اللہ کی ادائیگی میں چھپا ہوا ہے ورنہ تقدیر کے روایتی مفہوم کو مدنظر رکھ کر یہ کلمہ ادا کرنا ہے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا: کل انشاء اللہ مشرق سے سورج طلوع ہوگا'۔ کہ اگر اللہ نے چاہا تو مشرق سے آفتاب نمودار ہوگا اور اگر اللہ کا پروگرام بدل گیا تو ہوسکتا ہے وہ شمال یا جنوب سے ظاہر ہو جائے اب اللہ کی چاہت کو آزمانا کیا مشکل ہے' کوئی صاحب یہ کہہ کر دیکھ لیں کہ کل سورج مغرب سے انشاءاللہ طلوع ہوگا اور مشرق میں غروب ہوگا۔ وہ یہ ہزار بار کہہ لیں پر ہوگا کیا وہ مشرق سے ہی طلوع ہوگا اور مغرب میں ہی غروب ہوگا۔ اس لئے کہ خدا نے اپنی ''چاہت'' متعین کر دی ہوئی ہے یعنی اپنی مشیت غیر مبہم الفاظ وعمل میں واضح کر دی ہوئی ہے۔ لہٰذا جن قوانین خداوندی کا انسان شعور حاصل کر چکا ہے ان کے متعلق اسے پورے بھروسے کے ساتھ انشاء اللہ کہنے دیں کہ میرے رب کے قانون مشیت کے مطابق یہی ہوگا اور لکھ لیں عزتوں والا رب اپنے اس بندے کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا' اسے کبھی کفار (منکرینِ قوانینِ خداوندی) کے سامنے رسوا نہیں کرے گا۔ یہ بھی اس کی مشیت ہے' اٹل قانونِ مشیت۔

اب دونوں مفاہیم میں زمین آسمان کا تفاوت ہے اول الذکر معانی کی رو سے انسان کا مجبور محض ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سارا کیا دھرا چپ چاپ خدا کے کھاتے میں چلا جاتا ہے' یوں سزا جزا کا سارا عظیم الشان نظام آنِ واحد میں زمیں بوس ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نہ حساب کتاب' نہ میزان' نہ شہادت' نہ مقدمہ' نہ قیامت' نہ جنت' نہ جہنم۔ دنیا وآخرت معاذ اللہ بازیچۂ اطفال بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس ساری ذمہ داری انسان کے کندھوں پر آتی ہے اور وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں اس دنیا میں اور اس دنیا کے بعد پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دہ نظر آتا ہے۔ ویسے اس میں اکیلے جاوید چوہدری کا کیا قصور ہے۔ عہد موجود میں کم از کم ساری پاکستانی قوم کا یہی مسئلہ ہے۔ ہر فرد اپنے حصے کے منفی اعمال کسی اور کے سر منڈھ کر اسے ذمہ دار قرار دینے میں عافیت کا محفوظ تر گوشہ تلاش کر چکا ہے اور دوسروں کے کارناموں کا سہرا اپنے سر باندھ کر ہر قسم کا کریڈٹ لینا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ اس تناظر میں رہی سہی کسر ہمارے یہ دانشور پوری کر رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ''خاموش خدا'' جو موجود ہے۔ انشاء اللہ کہو اور سب کچھ اس کے کھاتے میں ڈال کر صاف بچ نکلو اگر اس کی ضمانت چاہتے ہو کہ وہ غضب میں نہیں آئے گا تو آستانوں پر نذر نیاز اور چندے تحائف لے آؤ' بےفکر رہو وہ اپنی جبیں پر کوئی بل نہیں لائے گا۔ انشاء اللہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد، ایم۔ڈی (فلوریڈا)

جنگل میں مور

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برھمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں سرِ محراب
پوجا بھی ہے بے سود نمازیں بھی ہیں بے سود
قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد

صاحبو! آپ کو وہ نعرے تو یاد ہوں گے ''ہمارا بھٹو شیر ہے باقی ہیر پھیر ہے''۔ ''مردِ مومن مردِ حق' ضیاء الحق ضیاء الحق''۔ ''قدم بڑھاؤ نواز شریف! ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔ اور الطاف حسین کے حوالے سے انتہائی خطرناک نعرہ۔ ''جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے''۔

اب اس منظر کو اٹھا کر ذرا امریکہ لے آیئے۔ ''بش آوے ہی آوے'' نا بھائی ''کیری آوے ہی آوے''۔ انتخابی دوڑ کے ساتھ امریکنوں سے زیادہ ہم پاکستانیوں کی بحث تیز ہوتی جاتی ہے۔ ٹیلی فون کی تاریں گرم ہو رہی ہیں۔ یہ آ گیا تو یوں ہو جائے گا۔ وہ آیا تو ''ووں'' ہو جائے گا۔ یہ آئے یا وہ آئے دراصل ہو گا کیا؟ جواب کے لئے اوپر درج کردہ اشعار ملاحظہ فرمالیں۔

فلوریڈا طوفانوں کی زد میں ہے لیکن چونکہ یہ ایک مقامی معاملہ ہے لہٰذا ہم اسے صرف ایک تبصرے کے ساتھ یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بحرِ اوقیانوس میں جتنے طوفان اٹھتے ہیں وہ امریکہ کا رخ کرتے ہیں۔ ان طوفانوں کی بڑی اکثریت افریقہ کے اس مغربی ساحل سے اٹھتی ہے جہاں سے چار صدیوں تک افریقی سیاہ فام زنجیروں میں جکڑ کر امریکہ لائے جاتے رہے۔ یہ قانونِ مکافات ہے یا محض اتفاق اس کا فیصلہ ہم آپ کی دانش پر چھوڑتے ہیں۔

ادھر وطنِ عزیز میں جرنیل صاحب کو وردی چپک کر رہ گئی ہے یا وہ وردی کو چپک کر رہ گئے ہیں۔ بہت سی خوبیوں والے جنرل مشرف صاحب اس کرسی سے محبت کر بیٹھے ہیں جو کبھی کسی سے وفا نہیں کرتی۔ اپنے نئے نویلے وزیراعظم شوکت عزیز صاحب ہیں جنہیں کرسی کے مقناطیس نے اپنی جانب کھینچ لیا ہے۔ ان علاقوں سے منتخب کروائے گئے ہیں جہاں ان کا

گزر تک نہیں ہوا۔ اپنے جمالی صاحب بلوچستان سے پہلے وزیراعظم تھے۔ عوام کے منتخب نمائندے' نرم مزاج اور خاکسار! ظاہر ہے کہ وطنِ عزیز سیاسی دھاندلیوں سے آزاد نہیں ہوسکا ہے۔ پڑوس پہ نظر ڈالئے تو سیاسی عمل کے جاری رہنے کی وجہ سے بھارت آئندہ دس برسوں میں بہت بڑی اقتصادی' صنعتی اور فوجی قوت بن کر ابھر رہا ہے۔ تعلیم' زراعت' امن وامان کے شعبوں میں بھی وہاں بہتری ہورہی ہے۔ تو کیا سب کچھ کالا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں' محسوس کررہے ہیں اس کی بہترین عکاسی حال ہی میں امریکہ کے ایک بلند پایہ سیمینار میں ہوئی ہے۔ اس سیمینار میں اور موضوعات بھی کچھ حد تک شامل تھے لیکن پاکستان دشمن عناصر نے ایک مردے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کئی گھنٹے اس موضوع پر صرف کئے۔ ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟'' خوشی کی بات ہے کہ امریکی دانشوروں نے ان پاکستان دشمن عناصر کے دانت کھٹے کردیئے۔ انہوں نے وہی کہا جو ہم کہتے ہیں کہ وطنِ عزیز میں لاکھ برائیاں سہی لیکن اللہ نے ہمیں مسائل سے نمٹنے کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ بدعنوانی' بدامنی اور سیاسی آپا دھاپی کے باوجود وطنِ عزیز کے ان گنت شعبہ ہائے زندگی میں نہایت تیزی سے ترقی جاری ہے۔ تعلیم' انڈسٹری' برآمدات' انفرمیشن ٹیکنالوجی' میڈیسن' دفاع' بین الاقوامی سطح پر اہمیت' جیسے شعبوں میں بحمداللہ ملک آگے بڑھ رہا ہے۔ اس وقت صوبائی ناانصافیوں کا احساس' مذہبی فرقہ واریت اور غربت ہمارے اصل مسائل ہیں۔ اور یہ سب مسائل داخلی ہیں جو حکومت اور سیاسی لیڈروں کی خاص توجہ چاہتے ہیں۔

دقیانوسی سوچ سے باہر نکلنے کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ شوکت عزیز صاحب کے بیان سے ہمیں سخت مایوسی ہوئی جب انہوں نے خشک سالی کو دور کرنے کے لئے قوم سے اپیل کی کہ وہ نمازِ استسقاء پڑھیں۔ انہوں نے مولانا صدر ضیاء الحق کی یاد تازہ کردی۔ تعلیم اور امریکہ میں طویل قیام' سٹی بینک میں اعلیٰ عہدہ انہیں روشن خیالی عطا کرنے میں ناکام رہے۔ وہ بھول گئے کہ طالبان کی دوسالہ استسقا نمازیں ایک بوند پانی نہ برسا سکی تھیں۔ خدا کا قانون ہے کہ وہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ''تم اللہ کی مدد کرو پھر وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ (القرآن)

تیس برس پہلے چین کا شہر بیجنگ گرم وخشک سرزمین تھی۔ ماؤزے تنگ نے اپنے ہاتھ سے پہلا پودا لگایا اور شہریوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی مثال کی پیروی کریں۔ صاحبو! اس دور کے پیکنگ اور آج کے بیجنگ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پرسوں اسامہ بن لادن کے دستِ راست سرجن ایمن الظواہری کا ویڈیو ٹیپ سامنے آیا جو امریکہ میں دن رات دکھایا جارہا ہے۔ صدر مشرف پر دوبار قاتلانہ حملہ کرنے والے (مبینہ) ظواہری نے بڑے ہی پراعتماد لہجے میں کہا ہے کہ امریکی استعمار بہت جلد جڑواں شکست سے دوچار ہونے والا ہے۔ پہلے عراق اور پھر افغانستان۔ ان صاحب کا دعویٰ ہے کہ افغانستان کے تین چوتھائی حصے پر آج بھی القائدہ اور طالبان کا غلبہ ہے۔ حامد کرزئی صاحب نے یہ کہہ کر اس بیان

کی تصدیق کر دی ہے کہ ملک کا بیشتر حصہ بدامنی کا شکار ہے۔ جنگجو سردار آپس میں نبرد آزما ہیں۔

دوسری جانب بہت سے امریکی لیڈروں سمیت دنیا کے ان گنت سیاستدان' صحافی اور دانشور تسلیم کر رہے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ناکام ہو رہی ہے۔ ایک دن ایسا نہیں جاتا جب دنیا میں جگہ جگہ بم دھماکے' فائرنگ کی وارداتیں اور ہوائی حملے نہ ہوتے ہوں۔ ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

صاحبو! دنیا میں جو حشر برپا ہے یہ طویل عرصے تک چل نہیں سکتا۔ یوں لگتا ہے کہ بنی نوعِ انسان نے پروردگارِ عالم کی نصیحت کو بھلا رکھا ہے کہ تمام انسان امتِ واحدہ ہیں۔ قدرت کا قانون ہے کہ جب اس کے اصولوں کی خلاف ورزی کی جائے تو حالات انسانوں کو مار مار کر ٹھیک کر دیتے ہیں۔

مشرق و مغرب میں بندوں کی اپنی پیدا کردہ تباہیاں اور خدا کے قانونِ مکافات کی چوٹیں مزید بڑھیں گی تو انسانیت کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ ہر خطہ ہر ملک پھر امن کی تلاش میں سرگرداں ہوگا۔ نہ آسمانوں سے کوئی اترے گا نہ زمین میں کوئی شخصیت نمودار ہوگی۔ وہ اس لئے کہ خالقِ کائنات کا آخری پیغام مکمل طور پر نازل ہو چکا ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ فرما دیا گیا ہے۔ انسانیت کی نجات اور فوز و فلاح کا طریقہ مفصل طور سے کتابِ حکیم میں موجود ہے۔ دنیا اپنے خود ساختہ نظاموں سے تنگ آ چکی ہے۔ انہیں آزما کر خوب پٹ چکی ہے۔ قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق جب سمندروں میں اور زمین میں بدعنوانی اور بے امنی چھا جائے تو خالقِ کائنات اہلِ عالم کو عذاب کے مزے چکھائے گا تاکہ وہ اسی طرح خدا کے تجویز کردہ نظامِ حیات کی طرف لوٹ آئیں۔ صاحبو! اسی طرح کے ارشادات آپ کو بائبل میں بھی مل جائیں گے۔ بہرکیف معجزہ کوئی رونما نہیں ہوگا۔ سرسید احمد خان اپنی تفسیر احمدیہ میں فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں میں معجزے اور کرامت کا اعتقاد نہیں جاتا اس قوم کا مہذب ہونا محال ہے۔ تالمود میں نہایت دلچسپ بات ملتی ہے۔ ''جو معجزے میں یقین رکھے وہ بے وقوف ہے اور جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے''۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کی اکثریت کرسچن ہے اور وہ معجزوں میں ہم سے بھی زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ پھر وہ ہم سے زیادہ مہذب کیسے ہو گئے؟ پہلی بات تو علامہ اقبال سے سنئے: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

بلاشبہ تہذیبِ مغرب میں ان گنت خامیاں ہیں البتہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر کے مقامِ آدمیت تک پہنچ گئے ہیں۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا یہی معنی رکھتا ہے۔ انسانی تہذیب کامل کیسے ہو سکتی ہے؟ جب بندے مقامِ مومن تک پہنچ جائیں یعنی اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور قوتوں کو سارے انسانوں کے لئے استعمال کریں۔ عنقریب انشاءاللہ یہی ہونے والا ہے۔ مور تو ناچ رہا ہے لیکن دنیا جنگل بنی ہوئی ہے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آفتاب عروج، چنیوٹ

دورنگی چھوڑ یئے.....

موٹر سائیکل میں پٹرول ڈلوانے کے لئے میں پٹرول پمپ پر رکا۔ پٹرول ڈلوا کر سو روپے کا کرنسی نوٹ سیلز مین کی طرف بڑھایا۔ سوکا نوٹ تھوڑا سا ماٹھا تھا' اس لئے سیلز مین خاصی دیر تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میں نے سیلز مین سے کہا کہ مجھے بقیہ ریزگاری دے دیجئے' آپ نوٹ کو ہی دیکھے چلے جا رہے ہیں۔ سیلز مین نے کہا کہ جی کچھ دیر پہلے ایک باریش نوجوان آیا اور پٹرول ڈلوایا۔ انہوں نے بھی سوکا نوٹ دیا۔ جب میں نے اس نوٹ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ قائداعظم کی تصویر پر سیاہی سے لکیریں ماری ہوئی ہیں۔ میں نے وہ سوکا نوٹ انہیں واپس لوٹاتے ہوئے کہا کہ جناب کوئی دوسرا نوٹ دے دیجئے' یہ نہیں چلے گا۔ اس باریش نوجوان نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ چونکہ نوٹ پر قائداعظم کی تصویر پر سیاہی سے لکیریں ماری ہوئی ہیں' اس لئے یہ نوٹ مارکیٹ میں نہیں چلتا' آپ اسے تبدیل کر دیجئے۔ اس پر وہ صاحب طیش میں آ کر کہنے لگے کہ قائداعظم کی تصویر پر لکیریں پڑی ہوئی ہیں تو کیا ہوا؟ کیا قائداعظم نبی تھے؟ جو ان کی تصویر پر لکیریں مارنے سے نوٹ بیکار ہو جائے گا؟ میں نے ان صاحب سے عرض کی کہ جناب آپ نے تو نبی کے چہرے پر بھی لکیریں مار رکھی ہیں' قائداعظم تو ایک انسان تھے' میں یہ نوٹ نہیں لوں گا۔ اتنی دیر میں وہ مجھے بقیہ ریزگاری دے چکا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور چل پڑا لیکن سیلز مین کے اس جملے نے ''آپ نے تو نبی کے چہرے پر بھی لکیریں مار رکھی ہیں'' مجھے حیرت و استعجاب کے گرداب میں پھینک دیا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ سیلز مین کوئی عالم فاضل تھا' نہ دانشور' نہ مولانا نہ مفتی' نہ علامہ اور نہ کالم نگار' لیکن جو بات اس نے کہہ دی' وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق کہی ہے۔ یہ بات کسی مولانا مفتی' کسی عالم فاضل' کسی دانشور' کسی صاحب جبہ و دستار کے منہ سے آج تک نہیں سنی گئی' جو پٹرول پمپ کے ایک سیلز مین نے کہہ دی ہے۔

یہ واقعہ مجھے ایک موقر اخبار (روزنامہ پاکستان لاہور) 22 جولائی 2004ء کے شمارے میں ایک معروف عالم فاضل کالم نگار (ابوعمار زاہد الراشدی) کے کالم (نوائے

قلم) کے ذیلی عنوان کے تحت (صوبہ سرحد میں نظام صلوٰۃ کے قیام کے اعلان پر منفی تبصرے کیوں؟) پڑھ کر یاد آیا۔ وہ کالم پڑھ کر مذہب پرست حلقہ یقیناً خوش ہوا ہوگا اور میرے محترم فاضل کالم نگار بھی سمجھتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنا دینی فریضہ ادا کر دیا ہے' لیکن بات یہ نہیں' جس طرح فاضل کالم نگار نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے میری ان سے درخواست ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ کیا ہر گھر' ہر عمارت میں مسجدیں بنانے سے دین کا نفاذ عمل میں آ جائے گا؟ کیا اس ملک کی چودہ کروڑ کی آبادی کے تمام افراد پنجگانہ نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگ جائیں گے اور کیا محض نمازیں پڑھنے سے اللہ کی کبریائی' اللہ کی حاکمیت قائم ہوسکتی ہے؟ کیا ہمارے ملک میں مساجد کی کمی ہے؟ ہمارے یہاں اتنی زیادہ اور بڑی بڑی مساجد موجود ہیں' جو کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہیں اور نمازیوں کے لئے نوحہ خواہ ہیں۔ کیا پولیس یا انتظامیہ کے جبر سے پڑھائی گئی نماز سے اس نماز جیسے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں' جو انسان میں قلب و نگاہ کی تبدیلی کے بعد بارگاہ خداوندی میں اپنے عجز و نیاز اور وارفتگی و خودسپردگی سے پیدا ہوتے ہیں؟ ہمارے ملک میں مختلف فرقے اور مسالک موجود ہیں' ان کے اوقات نماز و اذان بھی مختلف ہیں۔ کیا کسی کے عقیدے و مسلک کو جبراً تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ قرآن تو کہتا ہے: ''لا اکراہ فی الدین''۔

آج تک جتنے بھی انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے' ان میں سے کسی نے بھی کوئی حکم' کوئی آرڈیننس جاری کر کے لوگوں کو ایمان لانے اور نمازیں پڑھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اللہ کی عطا کردہ وحی اور اپنے اعلیٰ و ارفع کردار کی مقناطیسی طاقت سے انسانوں کے قلوب کو متاثر کیا۔ ریت کے ذروں میں سے لوہے کے ذرات (قلب سلیم رکھنے والے افراد)..... الشعراء (89)..... خود بخود والہانہ انداز میں دیوانہ وار اس شمع ہدایت کے گرد پروانوں کی طرح اکٹھے ہوتے چلے گئے اور اللہ کی ہدایت بتوسط رسول اکرم ﷺ ان پروانوں کے لئے زندگی کی تاریک راہیں روشن کرتی چلی گئی۔ پھر انہوں نے باہمی مشاورت سے وہ کچھ کر دکھایا' جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ وہ یہ تھے..... محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں' وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل..... (الفتح 29)..... جبکہ آج کا ہر عالم دین اپنے سر پر اپنے اپنے فرقے یا مسلک کا تاج سجا کر دوسروں کی تکفیر پر کمر بستہ ہے۔ اللہ کا رنگ کسی پر بھی نہیں چڑھا ہوا۔ جب تک ہم سب اللہ کے رنگ' ایک خدا' ایک کتاب اور ایک رسول ﷺ کی امت میں نہیں رنگے جائیں گے' نفاذ اسلام کا نام لے کر خود فریبی میں تو مبتلا رہا جا سکتا ہے' لیکن ببول کے درخت پر انگور نہیں لگتے۔

قرآن کریم میں سورۃ الانعام آیت 160 میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ اے رسول! جس نے امت میں فرقہ بنایا تو ان میں سے نہیں۔ میری فاضل کالم نگار اور دیگر علمائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ قوم کو یہ بتائیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا ہے یا اپیل کی ہے کہ یہ آیت تو میں نے نازل کر دی ہے' لیکن یہ

تمہاری صوابدید پر منحصر ہے کہ یہ حکم مانیں یا نہ مانیں۔ یا اپنی طرف سے بہتر، تہتر فرقوں کی خوشخبری دے دیجئے، جبکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا مزید یہ ارشاد بھی ہے..... ''اور جو کتاب تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اسی کی پیروی کئے جانا، بے شک خدا تمہارے عملوں سے خبردار ہے..... (احزاب 2)..... ''کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے..... (یونس 15)..... مزید..... اور ان لوگوں میں ایسے بھی ہیں، جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کریں اور مومنوں میں تفرقہ ڈالیں..... (توبہ 108,107).....

ہمارے ہاں کی تو ہر مسجد تفرقہ ڈالنے کے لئے ہی بنائی جاتی ہے جو مسجد ضرار کے زمرے میں آجاتی ہے۔ یہاں تو اللہ کی مسجد شائد ہی کوئی ہو اور آگے بڑھئے..... ''اے ایمان والو! مشرکوں میں سے نہ ہونا، نہ ان لوگوں میں ہونا، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقہ در فرقہ ہو گئے۔ سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے..... (سورۂ روم 31 اور 32)..... اور یہ شرک (فرقہ بندی) ناقابل معافی جرم ہے، بغاوت ہے (اسلامی مملکت سے) جو معاف نہیں کیا جائے گا..... النساء 48 و 116)..... اور جو اللہ کی رسی کو چھوڑ دے، ان کے بارے میں ارشاد ہے کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ در فرقہ کر دے اور ایک کو دوسرے سے لڑا کر آپس کی لڑائی کا مزا چکھا دے..... (انعام 65)..... اگر کوئی صاحبِ فرقہ بندی (امت میں لکیروں) کے خلاف مزید آیات دیکھنا چاہیں تو ان سورتوں میں ملاحظہ فرمائیں..... العمران 105، الشوری 13، القصص 4، البقرہ 176، الجاثیہ 17۔

یہ تمام آیات محکم آیات ہیں، انہیں کسی انسان کے قول سے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے امت میں (ابتدائی طور پر پاکستان میں) فکر و عمل کی ہم آہنگی، ایک رنگی کی قوت کو فروغ دے کر فرقوں (شرک) کی دیواروں کو مسمار کیا جائے تاکہ لوگوں کا خوف دور ہو۔ ایسا کرنے کے بعد لوگ خود بخود کسی جبر و اکراہ کے بغیر مسجدوں کا رخ کر لیں گے۔ بصورت دیگر آپ صدیوں شرک کے کنویں سے پانی کے ''بوکے'' نکالتے رہئے، شرک کا کتا وہیں کا وہیں رہے گا۔ جہاں شرک ہو گا، وہاں خدا ہو گا نہ رسول ﷺ..... وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا..... (الکہف 26)..... ہم تو گزشتہ ستاون سالوں میں یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ ''مسلمان'' کی تعریف کیا ہے اور ''سنت'' کسے کہتے ہیں۔ نفاذ اسلام تو دور کی بات ہے۔

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

(بشکریہ روزنامہ پاکستان، بابت 20 ستمبر 2004ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد ایوب خان، لاہور

حدود آرڈیننس

نوائے وقت 25 جولائی، سنڈے ایڈیشن میں محترم کے۔ایم۔اعظم نے جہاد افغانستان کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''ایک نابینا یتیم لڑکی کو ریپ کیا گیا۔اس کی شکایت پر حکام مجرم کو اس لئے سزا نہ دے سکے کیونکہ اس سانحہ کا صرف ایک گواہ تھا جبکہ اسلامی قانون میں چار گواہ ہونے چاہئیں مگر اس نابینا لڑکی کو جیل میں ڈال دیا گیا کیونکہ اس نے زنا کا اعتراف کر لیا تھا۔'' یہ خبر پڑھ کر ڈاکٹر لانگ جو پاکستان کو امداد دینا چاہتا تھا غصے سے پاگل ہو گیا اور ضیاء الحق کو برا بھلا کہنے لگا اور کہا کہ پاکستان کو ایک پائی کی امداد نہیں دی جائے گی۔وغیرہ۔

اس آرڈیننس کو بنانے والے تین جسٹس، دو وکیل اور پانچ علمائے دین تھے۔تعجب ہے کہ ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ عمل کا تعلق نیت/ارادہ سے ہوتا ہے۔(یہ بخاریؒ کی پہلی حدیث ہے۔) عورت کی نیت نہ ہو تو وہ زانیہ نہیں ہوتی اس لئے یہ زنا کا کیس نہیں۔اور اس میں اگر ایک گواہ بھی نہ ہو تو بھی دوسرے ثبوت تلاش کر کے مجرم کو سزا دی جا سکتی ہے کہ یہ ناموس پر حملہ ہے اور عورت کو برباد کرنے والا ہے۔

چند ماہ پہلے جب عورتوں نے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا تو میں نے اس کا مطالعہ کیا اور فروری میں اس پر تبصرہ لکھا اور بہت لوگوں کو بھیجا۔وہ مضمون اپریل میں نوائے وقت میں شائع ہوا۔اس میں میں نے لکھا کہ زنا بالجبر ناموس پر حملہ اور فساد فی الارض ہے۔ وہاں گواہ نہیں ہوتے۔اس کا ثبوت اور باتوں میں تلاش کیا جائے گا اور اس کی سزا موت ہے اور عدالت جائے وقوعہ پر پہنچ کر مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ایک اور غلط بات اس قانون میں یہ ہے کہ کنواری حاملہ لڑکی کو سات سال جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔حالانکہ اس کا گناہ ثابت ہے اور سزا صرف ایک سو کوڑے ہے۔

جب اس قانون میں ترمیم کی بات ہوئی تو مولویوں نے جنہوں نے اسے پڑھا بھی نہ ہو گا شور مچا دیا کہ ہم ترمیم نہ ہونے دیں گے۔پارلیمنٹ بھی مولویوں کے ڈر سے ٹالتی رہی اور اب بھی انہوں نے اسے نظریاتی کونسل کو بھیج دیا ہے۔یہ کونسل پتہ نہیں کیا ہے اور کس حیثیت کی مالک ہے۔

نئی خبر یہ ہے کہ شریعت کورٹ نے زنا بالجبر کے ایک کیس کو چھوڑ دیا۔میں نے انہیں لکھا تو انہوں نے جواب دیا ہے کہ ''شریعت کورٹ نے قرار دیا ہے کہ زنا بالجبر فساد فی الارض اور حرابہ ہے اس کے لئے نصاب شہادت دو بالغ مسلمان مرد ہیں۔'' گویا اب گواہ چار کی بجائے دو ہو گئے جو وہاں نہیں ہوتے اس لئے مجرموں کو کھل کھیلنے کی آزادی ہے۔ضروری بات یہ ہے کہ جہاں کہیں گواہ نہ ہوں وہاں دوسرے ثبوت تلاش کئے جائیں مثلاً طبی معائنہ، حالات، دیگر علمی ثبوت۔فیصلہ صرف گواہوں تک محدود نہیں ہونا چاہئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عاطف طفیل، لاہور

VOICE OF YOUTH

شادی کے لئے غیر موزوں افراد کی خصوصیات

☆ وہ لڑکا یا لڑکی جو اپنے ''تعینِ ذات'' کے لئے اپنے والدین کی تائید و تصدیق کا بالخصوص اور دوسروں کا بالعموم محتاج ہے اسے شادی سے اجتناب کرنا چاہئے۔ بالفاظ دیگر وہ لڑکا یا لڑکی جو اپنی زندگی کے فیصلے خود نہ کر سکے اور ہمیشہ اپنے والدین کی منظوری (Approval) کی جستجو میں رہے وہ بھی مثالی شادی کے لئے موزوں نہیں ہے۔

☆ معاشی اعتبار سے کسی کے دست نگر حضرات کو بھی شادی نہیں کرنا چاہئے۔

☆ پل میں تولہ، پل میں ماشہ جیسے جذباتیت کا شکار خواتین و حضرات کو بھی شادی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

☆ اپنے اندازِ نظر یا زاویہ نگاہ کو عین حقیقت سمجھنے والے خواتین و حضرات کو شادی کا امیدوار نہیں بننا چاہئے۔

☆ اختلاف رائے کو اپنی ذات کی نفی سمجھنے والے بھی مثالی شادی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔

☆ نرگسیت کے مریض بھی شادی کے اہل نہیں ہوتے ہیں۔

☆ دوسروں کو من و عن قبول کرنے کی اہلیت رکھنے والے بھی مثالی شادی کے لئے موزوں نہیں ہوتے ہیں۔

☆ اپنی زندگی کی ہر اعتبار سے ذمہ داری اٹھانے کی سکت نہ رکھنے والے بھی مثالی شادی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔

☆ اپنے جذبات پر اختیار نہ رکھنے والے بھی مثالی شادی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ شادی انہیں کرنی چاہئے جن کے دل کے ساتھ پاسبانِ عقل رہتا ہے۔

☆ ردِعمل کی نفسیات کے شکار لوگوں کو بھی شادی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ازدواجی زندگی میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا جاتا ہے۔ آگ پانی سے بجھتی ہے آگ سے نہیں۔

☆ محبت کو ''لینے'' کا عمل سمجھنے والے بھی مثالی شادی کے اہل نہیں ہیں کیونکہ محبت تو ''دینے'' کا عمل ہے۔ مانگنے سے تو بھیک نہیں ملتی تو پھر محبت کیونکر مل سکتی ہے۔ ویسے بھی جس سے محبت کی جائے اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کا آلۂ کار نہیں بنایا جاتا ہے۔

☆ محبت اساسی طور پر ایک رویہ اور سوچ کے ایک رخ کا نام ہے۔ محبت کا پھیلاؤ وسیع ہونا چاہئے۔ اس کا دائرہ کسی ایک شخص تک محدود نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے اپنے ہونے والے شوہر کو قبول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سارے خاندان کو قبول کیا جائے اور اسی طرح اپنی ہونے والی رفیقہ حیات کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سارے خاندان کو قبول کیا جائے۔ شادی ایک پیکج ڈیل ہے۔

☆ شادی کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رہے کہ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا ہے۔ ہر پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں۔ پھول کو کانٹوں سمیت قبول کرنے والے ہی مثالی میاں بیوی ثابت ہو سکتے ہیں۔

☆ شادی کے خواہشمند خواتین و حضرات یاد رکھیں کہ شادی کے بعد زندگی ویسی نہیں رہے گی جیسے شادی سے پہلے تھی۔ دونوں کو اپنا طرزِ زندگی تبدیل کرنا ہوگا۔ دونوں کو اپنے قلب و دماغ میں ایک دوسرے کے لئے جگہ بنانا ہوگی۔

☆ شادی کے وقت یہ بات دھیان میں رہے کہ آپ نے حل کا حصہ بننا ہے مسئلے کا نہیں۔

Email: atif_tufail2000@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد حنیف، سیالکوٹ

کیا موجودہ پاکستان تعبیرِ خوابِ علامہ اقبالؒ ہے؟

جب بھی کبھی آزادیٔ پاکستان کے حوالے سے تقریبات ہوتی ہیں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ''پاکستان تعبیر خواب اقبالؒ ہے''۔ پاکستان کو معرض وجود میں آئے تقریباً 58 سال ہو گئے ہیں اور علامہ اقبالؒ 1938ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کے بعد علامہ اقبالؒ کے ساتھی قائداعظمؒ کی قیادت میں آگے بڑھے اور برصغیر کے مسلمانوں کی آزاد ریاست کے قیام میں کامیاب ہوئے۔

علامہ اقبالؒ کا خواب کیا تھا؟

سب سے پہلے ہم نے یہ تعین کرنا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا خواب کیا تھا۔ ان کے تخیل کا پاکستان کیسا تھا۔ آزاد مسلم سٹیٹ کا تصور تھا، ایک امتِ واحد کا پاکستان، خلافت راشدہ والا پاکستان یا نبی آخر زماں ﷺ کے عہد والا پاکستان۔ علامہ اقبالؒ نے خطبہ الہ آباد میں وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے تک اسلام ملوکیت کے دور میں آیا۔ اس کے اوپر ملوکیت کی چھاپ ہے یعنی اصل اسلام نہیں۔ دور خلافت راشدہ والا اسلام نہیں۔ جو رسول اکرم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے متمکن ہوا۔ جب دور خلافت راشدہ ختم ہوا اور دور ملوکیت کا آغاز ہوا تو اسلام کی بنیادی ہیئت کو بڑے فن کارانہ انداز میں بدلا گیا۔ قرآن پاک کے الفاظ تو وہی رہے اس کے معنی بدل دیئے گئے۔ علامہ اقبالؒ نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ہمارے پاس جو اسلام ہے اس کے اوپر غیر اسلامی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ ان کو کھرچ کھرچ کر اتارنا ہوگا تاکہ اندر سے صحیح اسلام نکل آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ!

امت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

دراصل حقیقت تو قرآن ہی ہے جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ اس طرح قرآن کریم ہی ہمارا نظام حیات ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی نظام حیات نہیں۔

کیا علامہ اقبالؒ جمہوریت کے حامی تھے؟

علامہ اقبالؒ مغربی جمہوریت کے ہرگز حامی نہیں تھے۔ انہوں نے جمہوریت کو تماشا کہا۔ مغربی جمہوریت دراصل سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو بچانے کا ذریعہ ہے اسلام جس کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ اقبالؒ کا مقصد

آزادی سے مراد مغربی جمہوریت ہرگز نہیں۔ وہ تو اس وقت یعنی اس دور میں موجود تھی۔ اس کا مقصد آزاد مسلم سٹیٹ تھا جس کا سارا نظام قرآن کریم کے احکامات کے مطابق ہوگا۔ جس کے اندر عدل و انصاف ہوگا۔ کسی سے ناانصافی نہیں ہو گی۔ اسلامی معاشرہ میں نظام عدل قرآن کے احکامات کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ عدلیہ ہر ایک کو اپنے مقام پر رکھ سکتی ہے اس کے برعکس آپ پاکستان کی کسی بھی عدالت میں چلے جائیں۔ لوگوں سے ملیں، کسی بھی سائل سے بات کریں جو حصول انصاف کے لئے عدالت میں آیا ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ سب سے پہلے ایسا وکیل ڈھونڈے گا جس کے ججوں کے ساتھ تعلقات ہوں۔ جو اپنا موقف کسی نہ کسی ذریعے سے منوا سکے۔ اس کے باوجود بھی اس کو وکیل پر اعتماد نہیں ہوگا۔ پھر بھی وہ جج کا پتہ ڈھونڈے گا۔ اس کا کوئی رشتہ دار تلاش کرے گا۔ اگر جج کا رشتہ دار اس کو یقین دلوا بھی دے پھر بھی اس کو یقین نہیں ہوگا۔ پھر بھی وہ جج کے عملہ سے رابطہ کرے گا۔ کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی حمایت کے لئے راضی کرے گا۔ اس کے باوجود بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوگا۔ اس کے دل میں کھٹکا رہے گا۔ شاید میری مخالف پارٹی نے مجھ سے زیادہ ہمت کی ہو۔ جب سے پاکستان بنا ہے۔ عدلیہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارے ملک کا نظام عدل تشویش ناک حد تک خراب ہو چکا ہے۔ ہر حکومت نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند رکھیں کہ شاید بلی گزر جائے۔ لیکن بلی کہاں چھوڑتی ہے؟ کسی اعلیٰ عدالت کے جج نے کسی ماتحت عدالت کے جج کے فیصلوں کو چیک نہیں کیا کہ تم رشوت لے کر کون سے قانون کے مطابق انصاف کرتے رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر جج صاحبان نیچے سے اوپر تک گئے ہوتے ہیں۔ کبھی دیہاتوں میں مداری تماشہ کرنے آتے تھے۔ ان کے پاس پیتل کا بنا ہوا بیل ہوتا تھا۔ اس کے سینگ اوپر نیچے اور دائیں بائیں مڑ جاتے تھے۔ ایک شخص آ کر کہتا کہ ہمارا بیل چوری ہو گیا ہے۔ مداری پوچھتا اس کے سینگ کیسے تھے۔ بیل والا کہتا کہ اس کے سینگ ''تارے'' تھے (یعنی دونوں اوپر کو تھے) مداری ایک سینگ کو نیچے کر دیتا اور کہتا دیکھ لو یہ تمہارا بیل نہیں ہے پھر دوسرا شخص آتا اور کہتا کہ میرا بیل چوری ہو گیا ہے۔ آپ کے پاس ہے۔ مداری پوچھتا آپ کے بیل کے سینگ کیسے ہیں۔ بیل والا کہتا ایک سینگ نیچے کو اور دوسرا اوپر کو ہے۔ مداری دنوں سینگ اوپر کر دیتا۔ یہی حالت ہمارے قانون کی ہے۔ جس طرف چاہیں موڑ لیا جاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ہمارے ملک میں قانون کے متعلق کام نہیں ہوا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ عورت زنا اور قتل کی شہادت نہیں دے سکتی۔ کبھی عورت کی گواہی آدھی۔ کبھی ناقص العقل ہے۔ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ کیا یہی تعبیرِ خوابِ اقبالؒ ہے۔ جس نے کہا تھا ''آدمیت احترام آدمی است'' ''ہر انسان واجب احترام ہے'' (القرآن)۔ پاکستان علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تو تب ہوتا جب پاکستان میں بسنے والوں کی یکساں عزت ہوتی۔ ذات، برادری، غریب، امیر ان چیزوں کا عمل دخل نہ ہوتا۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ جب تک ہمارے ملک میں عدل و انصاف میسر نہیں آتا خوابِ اقبالؒ شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اب میں آتا ہوں دوسرے گوشے کی طرف جو ملک کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔

فرقہ واریت

کیونکہ یہ ملک اسلام کے نام پر لیا گیا ہے۔ یہاں پر ایک قوم ہی بستی ہے۔ جو اللہ پر' کتابوں پر' ملائکہ پر' یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اور ایک ہی کلمہ پڑھتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ ہم لوگ ہندوستان سے پاکستان آئے تھے۔ کافی عرصہ تک فیصل آباد کے ایک گاؤں میں رہے۔ وہاں ایک ہی مسجد تھی۔ فقہ جعفریہ' حنفیہ' اہل حدیث' دیوبند اکٹھے ہی نماز پڑھتے تھے۔ نماز جمعہ' عیدیں اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ فرقہ واریت کی خلیج بڑھتی گئی۔ آہستہ آہستہ ایسا وقت آ گیا کہ ایک دوسرے کی عبادت گاہیں محفوظ نہیں ہیں۔ اندر عبادت کرنے والے محفوظ نہیں۔ پولیس کے پہرہ میں نمازیں ادا ہوتی ہیں۔ نمازی جان ہتھیلی پر رکھ کر مساجد میں جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

فرقہ واریت پھیلانے میں وہ علماء شامل ہیں جو پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ جونہی پاکستان بنا وہ پاکستان آ گئے۔ ان کو پاکستان کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان ختم ہو جائے یا اس کی باگ دوڑ ہمارے ہاتھ میں آ جائے۔ ان کے علاوہ کچھ علماء یہاں پہلے ہی موجود تھے جو پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ حالانکہ وہ عقیدہ کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف فتوے جاری کرتے تھے لیکن ایک مفاد ان کا اکٹھا تھا کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان ختم ہو جائے۔ مثال کے طور پر مودودی مرحوم اور مفتی محمود مرحوم ایک دوسرے کے سخت خلاف تھے۔ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے جاری کئے لیکن جہاں ان کا مفاد مشترک ہوتا یعنی پاکستان کو کمزور کرنا ہوتا دونوں اکٹھے ہوتے۔ مثال کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جو تحریک چلی ''تحریک نظام مصطفیٰ'' دونوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ یہ تحریک صرف عوام کو دھوکہ تھا۔ بھٹو کو کرسی سے اتارنے کے لئے ایک سیاسی نعرہ تھا۔ جب ان کا مقصد پورا ہو گیا تو تحریک کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ حالانکہ انہوں نے عوام کے جذبات کو اس حد تک ابھارا کہ انہوں نے اپنے سینے گولیوں کے آگے کر دیئے۔ سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانیں دیں۔۔۔ معاملہ ضیاء الحق کے مارشل لاء تک آیا۔ فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ مولانا مودودی نے کہا کہ ضیاء حکومت کی حمایت کرنا عین اسلام ہے۔ جب کہ 1958ء کو ایوب خاں نے مارشل لاء لگایا تو مودودی صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی اور فرمایا تھا کہ ان کی مخالفت کرنا عین اسلام ہے کیونکہ اس نے طاقت کے بل بوتے پر حکومت پر قبضہ کیا ہے۔ حالانکہ ضیاء الحق اور ایوب دونوں ہی فوجی تھے۔ دونوں نے طاقت کے بل بوتے پر حکومتوں پر قبضے جمائے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کو حکومت میں نمائندگی دی۔ جب تحریک نظام مصطفیٰ چل رہی تھی۔ چوہدری ظہور الٰہی نے اپنی رہائش گاہ پر افطار پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں مفتی محمود صاحب اور شاہ احمد نورانی صاحب بھی شامل تھے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ روزہ افطار کیا۔ لیکن ان دونوں نے ایک ہی گراؤنڈ میں علیحدہ علیحدہ جماعت کرائی۔ یہ ہیں ہمارے بڑے بڑے دینی رہنماؤں کی قلبی وسعتیں اور کردار۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے کردار پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ ان کے پیش رو ان سے دو قدم آگے ہیں اپنے بزرگوں کے مشن کو

جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر مفتی محمود صاحب کے پسر ارجمند جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اخبارات میں بیان فرمایا کہ میرا باپ پاکستان بنانے کے جرم میں شامل نہیں تھا۔ ایسا ہی بیان مودودی صاحب کے لخت جگر فاروق مودودی صاحب نے دیا۔ ان کی نظروں میں جو لوگ بھی تحریک پاکستان میں شامل تھے سب لوگ مجرم تھے۔ یہ شاباش کے مستحق ہیں۔ یہ تو حالات ہیں بڑے بڑے صاحبان اور ان کے صاحبزادگان کے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب و مدعا یہ ہے کہ دنیا بھر میں خاص کر پاکستان میں اسلام کے نام پر سادہ لوح لوگوں کا جو استحصال ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں ایسے ہونے کا دکھ اس لئے ہے کہ یہ واحد اسلامی ملک ہے جو خالصتاً اسلام کے نام پر لیا گیا ہے۔ اسلام میں فرقہ واریت ممنوع ہے۔ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا' آپس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جانا''۔ (القرآن) اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی روشنی میں اپنے آپ کو پرکھیں کہ ہم فرقہ بندی کے مرض میں مبتلا تو نہیں' اگر جواب ہاں میں ہے تو جس جس نے فرقہ بندی اختیار کی اس کا اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

مندرجہ بالا احکامات کی روشنی میں اپنے آپ کو پرکھیں۔ کیا ایسا ہے' اگر ایسا ہے تو کیا ہم اس پاکستان کو اقبالؒ کا خواب کہہ سکتے ہیں۔ یہاں پر تو اپنی سیاست چمکانے کے لئے فرقہ واریت کو ہوا دی گئی ہے۔ امت مسلمہ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ہمارے دینی علمائے کرام نے بجائے اس کے کہ امت مسلمہ ایک ہوتی' ان لوگوں نے ہمیں ایک نہ رہنے دیا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ غالب ہونے کی بجائے اس حد تک مغلوب ہیں کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی عزتیں محفوظ نہیں ہیں۔ عراق میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا کیا گیا۔ ان کو ننگا کیا گیا' کتے بنایا گیا' اس کا سبب بھی ہمارے دینی رہنما ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جب ایران اور عراق کی آپس میں جنگ ہو رہی تھی سب عرب ملک عراق کے ساتھ تھے۔ مصر نے تو فوجی مدد بھی کی۔ بغداد میں صدام حسین نے علماء کی ایک کانفرنس بلوائی' اس میں بڑے بڑے علماء نے شرکت کی۔ پاکستان سے علامہ احسان الٰہی ظہیر شریک ہوئے۔ وہ واحد عالم تھے جنہوں نے فی البدیہہ تقریر عربی میں کی۔ اس نے ایران کو کیا کچھ نہ کہا' وہ جنگ دو مسلمان ملکوں کے درمیان تھی۔ جس کو بند کروانا چاہئے تھا نہ کہ کفر کے فتوے دیئے جاتے۔ یہ ہے ہمارے علماء کا کردار جس سے مسلمان ایک قوم نہ بن سکی میرے مختصر عرض کرنے کا مطلب و مدعا یہ ہے کہ دنیا بھر میں خاص کر پاکستان میں اسلام کے نام پر سادہ لوح لوگوں کا جو استحصال ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں ایسے واقعات رونما ہونے کا دکھ اس لئے ہے کہ یہ واحد ملک ہے جو خالصتاً اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اسلام میں فرقہ واریت اور گروہ بندی ممنوع ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام

اسلام مساوات قائم کرنے والا دین یعنی سسٹم ہے ہم اس کو نظام حیات بھی کہتے ہیں۔ پاکستان میں کاروباری نظام دوسرے ممالک کے کاروباری نظام کے مقابلے میں فرسودہ اور ظالمانہ ہے۔ آپ دوسرے ممالک کے کارخانہ دار کو دیکھیں' اس نے مزدوروں کو بہت سہولتیں دے رکھی ہیں۔ ان کے مزدور کو رہائش کی فکر نہیں ہے۔ بچوں کی تعلیم کی فکر نہیں

ہے۔ علاج معالجہ کی فکر نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مزدور پڑھ لکھ جائیں۔ ہمارے ملک کا سرمایہ دار ان کو اَن پڑھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اَن پڑھ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبالؒ کا یہ خواب نہیں تھا کہ دولت چند ہاتھوں میں چلی جائے۔ ہمارے زیادہ تر حکمران سرمایہ داری کو ہی تقویت دیتے ہیں۔ اپنے مفادات جبکہ نظریہ پاکستان ہمارے ملک کی اساس ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں عام آدمی کا معیار زندگی بلند کرنا' عام آدمی کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔

جاگیردارانہ نظام

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ جس کی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ایک کسان بمعہ اپنے اہل وعیال کے سارا سال کھیتوں میں محنت کرتا ہے لیکن ایک جاگیردار زیادہ حصہ اپنے گھر لے جاتا ہے۔ بے چارے کسان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ نہ تو اپنے بچوں کی بیماری کی صورت میں ان کا علاج کروا سکتا ہے اور نہ ہی ان کو تعلیم دلوا سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب نیا نیا پاکستان بنا تو جو لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے ان کو افراد کے حساب سے زمین دی گئی۔ مثلاً فی کس فی ایکڑ اور جہاں زمین کی پیداوار تھوڑی تھی یا زمین بارانی تھی۔ فی ایکڑ زیادہ دی گئی۔ پھر الاٹمنٹ کا سلسلہ شروع ہوا۔ محکمہ Settlement اراضی قائم ہوا۔ کھیتی باڑی کرنے والے افراد کن کن مصائب کا شکار ہوئے۔ پھر زرعی انقلاب کا دور دورہ آیا۔ یعنی دستی یا بیلوں سے کھیتی باڑی کی جگہ ٹریکٹروں اور مشینوں نے لے لی۔ مشینوں سے قبل جاگیردار کچھ مجبور تھا اور محتاج تھا۔ ساری زمینوں کو کاشت کرنے کے لئے اسے کسانوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ جب مشینوں کا دور آیا۔ جن لوگوں کا دارومدار کھیتی باڑی پر تھا ان کو بے دخل کر دیا گیا۔ ٹریکٹر خریدے گئے اور ٹیوب ویل نصب کئے گئے۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل سے قبل جس کے پاس بیلوں کی جوڑی ہوتی تھی سارا گھر مصروف ہوتا تھا۔ بیوی ہاتھ بٹاتی' بچے ہاتھ بٹاتے۔ اس طرح مشینوں نے ملک کی آدھی آبادی کو بے روزگار کر دیا۔ ماہرین منصوبہ سازوں اور پالیسی سازوں نے ان لوگوں کو بری طرح نظرانداز کیا جس سے ملک میں پیسہ' دولت چند ہاتھوں میں چلا گیا۔ جو غربت اور افلاس کا موجب ہوا۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان نہیں تھا جس میں مسلمان فرقہ واریت کا شکار ہوں۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہیں بھی محفوظ نہ ہوں۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان بھی نہیں تھا جس میں سرمایہ کے نام پر قارونیت فروغ پائے۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان بھی ہرگز نہیں تھا جس میں زمین کو اللہ کی ملکیت میں ہونا تھا تاکہ کسان کی دسترس میں ہو جبکہ اس پر جاگیردار قبضہ کر لیں۔ میں سوجھ بوجھ رکھنے والے باشعور پاکستانیوں اور دانشوروں سے اپیل کرتا ہوں کہ ابھی سنبھلنے کو وقت ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی قیادت میں عظیم قربانیوں کے بعد ایک قطعہ زمین حاصل کیا تھا اس کو علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر بنایا جائے جو عظیم مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

What is the End in Itself?

Individual or State

G. A. Parwez

English Rendering By
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque

==========

IMPORTANT NOTES

English-speaking readers may find the following explanations of terms used in this pamphlet useful:

Allah: It is the Arabic word for The One God. It is a misnomer to consider a name for God as God has no names, only attributes.

Deity: A god/God or goddess, Divinity. From Middle English *deite*, from Old French, from Late Latin *deitas* (stem *deitat-*), from Latin *deus*, god.

Deen: It is a term with no exact English equivalent. It is a "Way of Life", and in the Islamic context, is a social system based on Qur'anic values.

Jagannath: It is also known as Jagannatha, Juggernaut, Juggernnath, and Juggernnatha. In Hinduism it is a title of the deity Krishna, a huge wagon on which an idol of the god Krishna is drawn in procession. [From Hindi *Jagannath*, from Sanskrit *Jagannatha*: *Jagat-,* world+*nathas*, lord.] In *Hindu mythology* the ***chariot of Jagannath*** is specifically a vehicle used in an annul procession in Puri, in the Indian State of Orissa and is a symbol used for the owner of the world.

Kaafir: Literally "unbeliever". According to Sura 5, Verse 44, those who do not live by the Laws as revealed in the Qur'an are Kaafirs.

Muhammad: The name Muhammad, the Messenger of Allah, is generally followed by the salutation "Peace Be Upon Him". As this ("Peace Be Upon Him") is not used in the Qur'an, and for the sake of brevity, it is not used as such in this pamphlet; it has been indicated as PBUH or pbuh. However, it should be implicitly understood that, as

mentioned in Sura Al-Saaffaat 37, Verse 181, we do convey Peace Upon all the Messengers of Allah, and Praise be to Allah, the Originator and the Creator of the Universe.

Nubuwwah: It is the reception of the revelation of Divine Guidance by ***anbiya*** or ***rusul.*** It ended with Muhammad (PBUH). The Guidance revealed to him is preserved and enshrined fully and exactly in the Qur'an. But the function of ***risalah***, or the delivery of the Divine Message to all mankind and the establishment of a social order in accordance with its principles, has devolved upon the nation or ***Ummah*** that believes in that Book, that is, the Qur'an.

Shirk: It is the only unforgivable sin in the Qur'an. It is the association of partners with Allah, whether it be the human world or the physical world or the obedience to laws in contradiction to those revealed in the Qur'an. This includes creating divisions within the Muslim community through sectarianism.

What is the Genuine End?

Individual or State

The history of mankind makes tragic reading. Down through the ages we come across a series of sequences of the rise, growth, decline and fall not only of nations but even of their civilizations and cultures. The basic but the most intriguing question of the general aspect of mankind has always been whether the Individual is for the State or the State is for the Individual. In other words it means "Which is the end in itself and what are the means to achieve it?" Many renowned researchers and erudite thinkers have penned down their discourses on this subject. I am a humble student of Qur'an, present here 'what the Qur'an has said on the subject'.

Man is a social being. The urge of his life is to live in the company of other men. He is gregarious by nature and, in the words of the renowned western thinker, Nietzsche: He can become human only when he is in the company of other men. Our experience also stands proof to this reality. If the human child, just after his birth, is left in a jungle, without the supervision of any human, and some animals bring him up, he will remain animal in his behaviour for the whole tenure of his life. He will never attain the posture and status of humanity, though he would be just like other humans in the pattern of his figure and form.

Look to another aspect of human life. Of all the punishments the human mind could devise, solitary confinement is the most severe, the most cynical, and the most ironical. The cruelest criminals of the strongest nerves, not afraid of the death sentence even, start crying when they are kept in solitary confinement, even though there be no physical sufferings. Have you ever thought of the phenomenon that the concept of 'chastisement in grave' is more terrifying than that of the scene of the 'resurrection day'? Its root cause is nothing but the solitary confinement. There, in the grave, the dead body is in a solitary state, whereas there are tens of thousands of men, lurking and hovering, in the 'resurrection day'. Supporting this contention, one of the sayings goes that "the crowd of the dead is nothing but rejoicing of a festivity". And the other old proverb recalls in the mind that "man is the remedy of man". Even the word 'Society' inherently connotes the concept of ten (10); it is composed with the mixing of a (single) digit with the other digit, even though the other is zero. The evolution of human society can not come into being without the coming of one individual together with the other.

Tribal Life

The family used to be the stepping unit of the collective life in the very fore most period of human life. Dependence on family used to satisfy the cultural and social needs of the individuals. When the family multiplied a bit, it took the form of a tribe. The tribal life usually used to be nomadic, wandering and traversing here and there, every day, every morning and every evening. Therefore, there was no question of any specific area reserved for the tribes. When they first started flock keeping and then opted for

agriculture economy, the question of specified and demarcated areas popped up: this piece of land belongs to so and so a tribe, that meadow to such and such a clan. Thus developed that concept in the human mind that slowly and gradually took the form of a country or a land of birth. They started saying: "This is country; that is our country." The nature has never demarcated such boundaries on the surface of this earth; these are man-made only.

Prior to this demarcation of boundaries on the face of earth, self-preservation was the main urge of life; it was maximally extendable to the preservation of health, hearth, and wealth. Now it has extended and has covered the safety and security of 'land of birth' or country. In other words, the question of preservation had not remained limited to safe guarding the individuals; nonetheless it has more intensely involved the safety and security of the country. For deciding mutual disputes of the individuals and defending the country, the need of a collective full-fledged authority was a must. This produced the concept of governance or the idea of the State Authority. For a long time, the idea of politico-cultural life of the men remained restricted to country and its governance. Thereafter, the Greek scholars, especially Plato (c. 428-347 BC) showed up another idea, which is termed as State. If looked generally (but nay, to me it is a fact that) State is but an establishment of governance in a country. But the political philosophy made such an addendum to it that it revolutionized its concept. Initially it was a simple issue: country meant a specific track of land, its defense meant the safety and security of the hearth and wealth of its inhabitants. This was achieved through a system, called rulership. When it was transformed into State, the questions arose:

- ✧ What is the mutual relation of State and Individual?
- ✧ Which of these two is the means and which one is the end?
- ✧ And the like.

These questions generated various theories, such as:

1. Monistic Theory, which means the individuals are the integral part of the State; they do not enjoy their own separate entity
2. Monadistic Theory, through which it is accepted that State is nothing but a conglomeration of individuals
3. Dualistic Theory, which means the individuals have their own separate distinct existence but they are dependent upon the State or Society for their betterment and welfare.

Had it been so far, so good it would have been. But later on a new theory was put forth, which transformed State **as an end in itself**. This theory is called Idealistic Theory or Absolute Theory. It is not intended to expose, elaborate and illustrate the Theory of State from the political science point of view. My concern in this discourse is the mutual relation of State with Individual, so I'll not deliberate upon the details of the various theories of the State. After this brief introduction of the various theories, I want to move

direct to my topic. Since the Idealistic Theory is basically related to the topic under discussion, a detailed description on this behalf is necessary. Hobbes (1588-1679), an English political philosopher and thinker initiated the basic concept of this theory: individuals, in the real sense, are the slaves of the State. And Hegel, the German philosopher, provided a complement to this theory.

Hegel's Theory of State

Hegel (1770-1831), a German philosopher, insists that "the State possesses an 'organic' unity, which 'is dialectic'; a unity of contraries. It not only allows but even requires the strongest tensions and oppositions." It has its own separate entity and unique personality. Like every living and conscious being, it has its own aspirations, passions, and intentions. Its rights and obligations are finite. "There is no longer any moral obligation for the State. If there is any duty to the State it is the duty to preserve itself." If there is a clash between the individual and the State, the State will stand justified.

The State enjoys absolute rights. Cassirer, a renowned Americo-German thinker, has explained this theory of Hegel in the following words:

> **State is the self-certain absolute mind, which acknowledges no abstract rules of good and bad, shameful and mean, craft and deception.**
>
> **(Myth of the State, P. 264)**

He also writes in the same book:

> **It is generally acknowledged and well known principle that the particular interest of the State is the most important consideration. The State is the spirit that dwells in the world and realizes itself in the world through *consciousness,* while in nature the spirit actualizes itself only as the other of itself, as dormant spirit. It is the course of God through the world that constitutes the State. When conceiving the State, not of particular institutions, but one must much rather contemplate the *Idea,* God as actual on earth, alone.**
>
> **(Myth of the State, P. 265)**

Hegel propounded this theory in the 19th century (in 1801) and slowly it spread in the entire world. Rumelin, Chancellor of Tubingen University, wrote in 1875 that:

> **The State is autocratic. Self regard is its appointed duty; the maintenance and the development of its own power and well-being. Egoism - if you call this egoism - is the supreme principle of all politics. The State can only have regard to the interest of any other State so far as this can be identified with its own interest. Self devotion is the principle for the individual; self assertion for the State. The maintenance of the State justifies every sacrifice, and is superior to every moral rule.**
>
> **(R. H. Murray, The individual and the State, P. 216)**

From the above-mentioned illustrations, you would have seen that according to this theory Divine Rights had been given to the State. That is why this type of thought and this kind of procedure are known as Divinisation of State i.e., to make the State a god. In this way the State becomes a lord, and its individuals its worshipers. This has become a modern religion and has its own beliefs and code of conduct. In this religion, the State attains the status of god.

As has been said earlier that Hegel propounded this theory, which slowly and gradually dwelt in the world and now has attained the status of "religion" all over the world. The terms would be different, the words would also be variant, but politically the State, in the real sense, enjoys the same status every where. Every where the word State is talked of as if it is really a living personality, having the status of a deity, of a god or of a lord. It was the same concept of the present-day-fashioned deities about whom Dr. Muhammad Iqbal (1876-1938), the Muslim thinker, had said that the concept of country is the biggest deity of the day. The position of the Divinisation of State is that whenever it is said 'it is the demand of the State', no body dares to object it or criticize it, or even to open mouth against it. Compared to the superiority of its order or its demand, the individual's interest, expediency, demand, aspiration, desire and passion carry no weight. The individuals come into being to be the slaves to the State, to be the means to accomplish its demands. Individuals hold no will. It is the State that enjoys the universal will and the supreme power. The individuals should be prepared to lay down their life for it. Whenever the State has any demand, it is the duty of the individual to accomplish it unhesitatingly. Whatsoever it demands, he should humbly present it to the State, even though it is the life itself. The life is no exception.

From the last so many years, this position of the State has been so well propagandized that the thinking faculties of the people appear to be paralyzed. Whenever it is said **'it is the demand of the State '**or **'it is the order of the State'**, no one thinks or asks any one as to **'where is that State? which has issued this order? where does it live? and where can it be found?' Is there any possibility to meet it so that it could be asked whether it has issued this order?** Neither any one asks, nor any one answers, but it is the State that continues implementing its orders. And it is the people that continue blindly following as such. The Deity of the State and the concept of its absolute powers dwell sacredly in the hearts of the people. You will be wonder struck to know that the people ask for the proof of the existence of God. But no one demands any proof for the existence of the State, nor any arguments, nor the reasons even. And continue following the unseen existence and unlimited authority of the State without any speck of doubt in their heart and mind. It is as if it is an established reality that they obey and deem no arguments, no reason or rhyme.

Reality of the State

If you calmly analyze the elusive entity of State you have accepted without any reason or rhyme, you will come across the same phenomenon, which Sultan Mahmood of Ghazna, Afghanistan, found in the temple of Soumnat, a city on the western coast of India. When

Mahmood conquered Soumnat in 12th century, varying supranatural fictions about the statue of Soumnat, were wide spread among the masses. The most amazing among them was 'when the people pray it for their boons, it answers them and all the people listen it answering'. Mahmood was a monotheist; he could not be trapped in such deceitful jugglery. He cast a deep eye at the present form of the temple and the statue. All of a sudden he perceived the reality and with one stroke he broke the back wall into pieces. He saw Hindu priests sitting there to answer their pray. Likewise when you remove the fold of the statue of the State, you will find a few authority-vested individuals sitting behind this curtain, holding the contract of the rulership as the legal basis of all civil power. Their orders are the orders of the State, their decisions and judgements are the decisions of the State, their interests are the interests of the State, and their demands become the demands of the State. These authority holders, on the name of Divinisation of the State, get themselves worshiped by the individuals of the society. With this kind of analysis i.e., removing the curtain of the State, you will find no separate existence of State in the world. It remains nothing but an abstract idea. The concrete reality is nothing except that it is a country and has a Governing body vested with power and authority. You look to it again and again, you will find these two solid things in this idol-temple of the State; there is no third thing in it. The fact of the matter is that when autocracy became notorious, the men's lust of power and exploitation created another mode of governance and called it State, which had become notorious in the garb of dictatorship and monarchy. Under the imaginative piety robes, it was assigned the status of Divinisation of the State. Whatsoever be the system of governance, it will have the very character and essence of the will of monarchy. In the dark ages of the man, the king used to issue orders in his name. And now in this age of modern civilization, the same orders are issued in the name of the State, which has no separate existence except the will of the ruling authority. The orders of those days were by the authority holders and the same prevails today. In both the systems the authority wielded the same status and position. The only difference is that when the orders were issued in the name of the king, he used to accept their responsibility and the subject knew it well: who is responsible for these orders? And now the orders that are passed in the name of the State, neither is there any one to accept their responsibility, nor can it be determined: who is responsible for them? In those days the king used to be notorious by his wrong orders; now such orders do not defame any body because these are from the State, which is an abstract idea, have no external existence, and exists in the minds of the people alone. In the dark ages, such a kind of elusive persona holding power was called deity or god, now it is called State. As neither can any one see these deities or gods, nor can any one criticize their orders, similarly neither can any one see the goddess of the State, nor can criticize its orders. The people, in those days, were crushed under the authority of the king, the chariot of Jagannath, and now are sacrificed on the altar of the goddess of the State. The objective is the same. It was the satisfaction of the blood-sucking passions of the priests of the goddesses, and now is the satisfaction of the State. The difference is of words and the terms used. How do the words harp up in our days, Erich Fromm (1900-1980), a German

born renowned American psychologist, in his book **Escape From Freedom**, has shed light on it:

> **Never have words been more misused in order to conceal the truth than today. Betrayal of allies is called appeasement, military aggression is camouflaged as defense against attack, the conquest of small nations goes by the name of a pact of friendship, and the brutal suppression of the whole population is perpetrated in the name of National Socialism. (PP. 300-301)**

And we want to add to it that the monarchy of the ancient times now has been concealed in the term of State. It has been made ambiguous and imaginative to the extent that no clear conception of the State can come in the mind. In spite of this fact, this deceitful doctrine has been made such a reality that the individuals are unhesitatingly sacrificed for it. And it is all done on the precinct that the individuals are for the State. The question is **'what is the proof that the individuals are for the State?'** Its answer lies in a simile of Aristotle.

Jugglery of Similes

Keep it in mind that the wrong use of similes has wrought such a loss and harm to the world of humanity that no one can guess it. The wrong simile projects wrong as right. Even it deceives the best prudent easily. Since the reality is abstract, it does not come perceptibly to the mind. The simile is used with concrete things, so it adheres quickly to the mind. If it is right and relevant, it makes the abstract reality understandable but if it is deceitful, it makes right as wrong and wrong as right. The Qur'an calls the deceiving-idea-ridden similes as "poetry" and emphasizes not to use it. The conceptions of mysticism are based on similes; hence "poetry" supports it. That is why Ali Hazeen, a Muslim Sufi (mystic), had said: "Mysticism is the best mode for poetry." One or two examples will make it clear. One of the beliefs of mysticism is monotheism, which in simple and brief words means the things visible in the universe do not have their own existence; God alone has existence and is visible in various forms and patterns. These various names and patterns of the things deceive us, otherwise reality is one and the same every where. The cause of all the religious wrangling, and bickering is the very disagreement of these names; otherwise reality every where is the same; the same is Raam (the god of Hindus) and Raheem (the Allah of the Muslims); the same is in the idol temple and the Ka'ba. It is evident that this idea or belief is absolutely wrong. But look to it how beautifully does a wrong simile project such an open deception as reality! That simile is: "The 'Ganges' is the same, but the 'ferries' are numerous; it is nothing but the confusion of the wits." You see this simile outweighs tens of thousands of arguments. This simile sticks to the mind and no reason works against it.

Or take another example. The mysticism has to pass on the concept that direct achievement of beneficence of God is impossible. When the refulgence and manifestation of Allah is achieved through the beneficence of the spiritual guide, it produces stimulating effect. In terms of a simile, it can be understood that if you 'keep a flock of cotton in the sun for the whole day, it will maximally become hot. But if the same rays of

the sun pass through the converging lens, this flock of cotton will start burning within seconds.' Similarly when the rays of Allah's love pass through the converging lens of spiritual guide's look, the heart of the disciple transforms within no time into a pirouetting flame and burns every thing except Allah.

The Simile of Aristotle

This is what the wrong use of the similes does. Look, how the simile of Aristotle (384B.C. – 322B.C.), a Greek ethical, metaphysical, and political philosopher, presents pleasantly as reality the deception that the existence is only of the State and not of the individuals! He says as the State is to the individuals so is the human body to its organs. The human organs do not have their own separate existence. These are simply the integral parts of the body. Their life and death are tied to the life and death of the body. Their duty is to supply the provisions of life and means of health to the body. This garners the arrangements of their own life and health. No organ can survive without the existence of the body. The expediency of the body is the prudence of the organs. Hence the organs cannot have rules and regulations other than of the body's. Nor do the organs become the integral parts of the body on their own wish and will. And likewise nor can they be separated from it on their own.

I shall speak of the weakness of this simile later on. You have seen here that on the basis of this body-organ relation, the individuals have no separate existence. They become the means of establishment, solidarity, and promotion of the State. And the State becomes the end in itself. We have also understood that if the theory of the State is analyzed, it is nothing else than the body of a few members, who have authority. This is a deceiving veil, coined for concealing dictatorship and totalitarianism in its garb. As has been exposed earlier, Hegel (1770-1831) propounded this theory, Nietzche (1844-1900) made it grow, Hitler (1889-1945) provided it the mould of Nazism, and Mussolini (1883-1945) transformed it into fascism. And in the Social Republics, it was exposed as Dictatorship of Proletariat. The democratic countries are proud to say that they do not have dictatorship, they have democracy, the Government of the people, in their countries. But this is a deception too. These countries have the same concept of the State as do the dictator-ridden countries have. The individuals have no importance there. Recently an American psychologist, Charles M. Fair, has published a sophisticated but reality exposing book. Its very name, **The Dying Self**, brings forth its contents and the true picture of this unfortunate contemporary man. He has written varieties of tactics the contemporary man has devised for crushing the 'I-am-ness' of the individual. He says leave aside the autocracy; even democracy is not less harmful. In support of his assertion, he has deduced much from DE – Tocqueville's book: **Democracy in America**. A gist of one excerpt from his book is given below:

The shackles and the tyrants were the blunt tools, which the exploiters used to use in the past. It is as if the kings had physically actualized exploitation in those days but the democracy of the present time has made it out and out a mental problem. Now the master does not say: **"Think in terms of what I think otherwise you will be killed."** Now he

says: **"You are free to have your own thinking. In spite of this disagreement your life, property, and the other possessions will all be safe. All that would happen is that you would be lonely in the society. You will live with the people, deprived of your human rights. Your fellows will hate you as a filthy thing is despised, even those who think you are innocent and faultless will sever relations with you, so that the people may not hate them."** The master says to them; **"Go and be in peace; I have spared your life."** But this is the life, which is even worse than the death.

(The Dying Self, P. 185.)

This is the status of the individual in the democracy. In this system snapping ties with the majority, the individual becomes wet paint; no one wants to develop relations with him. He remains lonely, deserted, dejected in the whole world. What happens with the people left lonely in the living society can well be judged from the book compiled and published recently by the two journalists. With the help of the data and detailed observations of the individuals, they have presented the status of the American society. The name of this book is **"The Lonely Crowd"**. In such a society an individual lives with the other members as the cogs of a machine are with one another. During the last two or three years, I have mostly been referring quotations from the various books of an American psychologist, Erich Fromm. In one of his books, **Escape From Freedom**, one reference of which I have already given, he writes on this topic:

> **The person who gives up his individual self and becomes an automation, identical with millions of other automations around him, need not feel alone and anxious any more. But the price he pays, however, is high; it is the loss of his self. (P. 209)**

In his other book, **The Revolution of Hope**, he writes that **the society in which the man is dehumanized, his political freedom does remain no more freedom, but slavery (P. 91)**. The same author further writes that the obligation of the society is to respect the human life. The positive or the good act is the one that facilitates the development of the individual's latent potentialities. And the negative or evil act is one that strangulates the life and stagnates the human activities (P.93).

Ernst Cassirer, who has been mentioned earlier, is a world known philosopher. He died recently. His last book, **The Myth of the State**, is about the problem of State. Discussing on the rights of individual and State, he writes:

> **There is, at least, one right that cannot be ceded or abandoned: the right to personality . . . There is no *pactum subjectionis*, no act of submission by which man can give up the State of a free agent and enslave himself. For by such an act of renunciation he would give up that very character which constitutes his nature and essence: he would lose his humanity. (P. 175)**

Discussing on the rights and responsibilities of the individual and State, Professor I. MacIver, in his book: **The Modern State** writes that the State governs to serve the individuals. It takes the wealth of the country to repay the debt of the individuals. It

creates the rights, not to give charity as an upper hand on the basis of authority it enjoys, but as its agent. Keep it in mind that the individuals are the Masters, not the slaves of the State. It is clear the slave cannot enjoy higher authority than the Master can. As are the human rights determined and restricted in terms of their responsibilities, so ought to be the rights of the State (in relation to its responsibilities) (P. 480).

Right from here the weakness of Aristotle's simile of body-and-organs relation becomes clear. It was this simile on the basis of which he called the State as the end and the individual as the means to that end.

The Hollowness of Aristotle's Simile

He said it is the body alone that has existence; the organs do not have their separate distinct entity. This assertion opposes the reality. The existence, in fact, is of the limbs and the organs, and not of the body. The body is simply the collection of limbs and organs, mutually linked with co-ordination, co-operation, proportion, and regulation. You go on cutting separately the various organs of the body, the legs, the arms, the torso, the head etc., you will see these parts lying separately, but the body will disappear. The existence of the body is merely a mental and conceptual phenomenon. Intrinsically it does not exist outside. Health is a balanced proportion of the various limbs and organs. When any one or some organs lose this balanced proportion and fail to perform their operation, it is called disease. If any organ becomes deadly poisonous, it is generally said 'in order to save the body, the essential thing is to cut it off'. Such is said simply because of the general use of this word (body), otherwise, from factual point of view, it should be said it is essential to cut it off for the sake of health and safety of other organs. This makes it clear that the individuals have their own separate identity and existence. No State can come into being, if prior to it the individuals do not exist. If there is no existence of State as a distinct entity, there can still be individuals living. And are alive nonetheless. But if there are no individuals, the State can never be thought of. When the individuals determine to live with mutual agreement, discipline, co-operation, and balanced proportion; they also determine to gain power for their safety, and survival, then this way of life will be termed as society or State.

The simile of **'individuals as organs and State as body'** was, in fact, coined for Plato's theory of division. According to this theory the slaves remain slaves forever, and the ruling class, whom he calls Guardians, always the ruling class and its example is like of organs of body. Foot always remains foot and so is the head. It can never happen that the foot, by enhancing its potentialities, may replace the head and vice versa. Every organ has its own position determined by birth and there can be no change in it. Therefore, no organ should aspire to become such and such organ, and neither should it try as such. Nor should the low-level organs rebel against their assigned duties only because these are of low level. With this simile, Plato said that the class division was by birth and was unchangeable. And Aristotle, with this simile, made the individuals the slaves of the State. You see how the wrong use of the similes transforms the right as the false and the

false as the right. Sir Mohammed Iqbal, the renowned Muslim thinker, interprets it as the spell the magic of the ruling class.

Aristotle coined this simile; Hegel founded the entire edifice of politics on it. Its result is that every where in the world there is autocracy, whatever name it is assigned with. In this regard, there is no difference between dictatorship and western democracy.

This spell of the ruling class functions with the illusory concept of the State, which is the end in itself, and the individuals are the means to justify it. Erich Fromm makes this difference of dictatorship and true democracy clear in the following words:

> **Democracy is a system that creates the economic, political, and cultural conditions for the full development of the individual. Fascism is a system that, regardless under which name, makes the individual subordinate to extraneous purposes and weakens the development of genuine individuality.**
>
> **(Escape From Freedom, P. 301)**

Bergson (1859-1941), a French philosopher, has explained this important point in the following words:

> **This will be sovereignty, not over men, but over things, precisely in order that man should no longer have so much sovereignty over men.**
>
> **(The Two Sources of Religion and Morality. P. 300)**

Lust of Power

Cassirer says that this holistic, autocratic, comprehensive, and cruel concept of the State is the creation of people's lust for love. About this lust, he writes:

> **Obviously we do not wish for the sake of wishing - we aim at a certain end and we try to attain this end. But the lust of power does not admit of any possible attainment. It is the very character and essence of the will of power that is inexhaustible. It can never come to a rest; it is a thirst that is unquenchable. Those who spent their lives in this passion are comparable to the Danaides: they strive to pour water into a leaking butt. The appetite for power is the clearest example of that fundamental vice that, in Plato's language, is described as "pleonexia" – as the "hunger for more and more." This craving for more and more exceeds all measure and destroys all measure – and since measure, right proportion, "geometrical equality" had been declared by Plato to be the standard of the health of private and public life, it follows that the will to power, if it prevails over all other impulses, necessarily leads to corruption. "Justice" and the "will to power" are the opposite poles of Plato's ethical and political philosophy.**
>
> **(The Myth of The State. PP. 74 – 75)**

And when this lust of power is concealed in the sacred robe of "State Interest", these lust hungry mongers lose the prick of their conscience, which often emerges against the open tyranny. You make the other men means of consolation for satisfying your own passions of revenge, and torture them, then (even if your own conscience is dead) the other people will protest against it. But when this is said, **"Doing it is in the interest of the State"**, then in stead of opposing it, the people will generally extend support to it. You will be thought of as the patriot and well wisher of the State. And the strange phenomenon is that no body will ask you whether doing this is really in the interest of the State. If any body raises a voice against it, he is told that the disclosure of this secret is not in the interest of the State. Nonetheless, as has been explained earlier, the existence of State is an imaginary concept. By eradicating this deceptive idea, if it is clarified in mundane terminology, then the end and standard of collective system of the men will be the interest of the individuals. This is such a concrete standard where neither can any one be deceived, nor can any one deceive some one else. But the concept of State is an amazing show where the State is rich and the individuals are poor; where the State is strong and powerful and the individuals are weak, feeble, and frail. And where the wealth of the State increases and the individuals go on becoming poor to poorer to the poorest. (According to the deceitful simile of Aristotle) the organs become gaunt but the body is said to be growing strong and stout. The organs are crushed or cut off one by one, but it is understood that the body is nourishing. This development, prosperity, robustness, and energy are, in fact, of those with whom the authority is vested.

(As has been described) "State" is the name of these attributes; it does not have a separate distinct existence. If, anyhow, you have to acknowledge the existence of this "phoenix", then accept yourself and make others accept this reality that the criteria of measuring the prosperity, the strength and the weakness of the State are the individuals of the State. If the individuals are prosperous, strong, stout, and dauntless, the State will also be rich and powerful. If the individuals are always prey to fear, pain, grief, and destitute, then the State is dried-up and struck with poverty. That is why Mohammed Iqbal, the world reputed Muslim philosopher, has said, **"Every individual is the glaring stroke of good fortune of the nation, of the State".**

From the aforementioned illustrations we have seen that by carving the non-existent idol of the State, how the man's lust of power has made wide open the ways of tyranny! And how well it has justified them! How much precious blood of the humanity has been sacrificed on the altar of the old hag, the black deity! How many sacrifices of the man fit-to-be-burnt are there, with which the sadistic nature of the tyrants is consoled! The facts of the matter are that whatever the priests, in theocracy, do in the name of God, the same, in secularism, are done in the name of the State. Neither could any one ask from God "whatever is done with us on your name was really your demand". Nor can any one ask from the goddess of the State "whatever sacrifices we are compelled to offer, are really your order". The God of theocracy was imaginative and conjectured; the deity of the State is also mental and imaginary. That was the deceitful idea conjectured by the Hindu priests, and this is the spell-ridden concept knit by the Hindu bankers. The only

difference between the two is: "that was knitted of the looms of dark ages, so it was coarse and thread-bare; this is made of the machines of the modern civilization, hence is so fine and subtle that no body's look does penetrate into the inherent deception it has."

Qur'an's Reality Opening Message

The Qur'an was revealed. It exterminated all the man made idols from the mental horizon of the humanity. The Qur'an brought the collective infrastructure of the man. But you will be taken aback to know that the word State is not found in it. It has given only two ingredients of this infrastructure: One is the country, a track of land and the other is the man, the inhabitants of that country. It defines and determines the borders of the country for initiating its program. In other words, it starts its program from a track of land; it is the only possible and easy method, otherwise it has the entire globe of earth as its end. It wants to spread this system in the entire world. It insists to protect this piece of land (which has to be the first lab of this program). It is because if it remains safe and secure, this experiment will be conducted peacefully. It also insists to make arrangements for protecting it from the earthly and heavenly calamities. It describes the events of the nations gone by and tells that their abodes were destroyed with the floods, wind storms, earthquakes, volcanic eruptions, and the dilapidation of the Dams. The purpose is to tell you to keep your country safe and secure from such calamities and catastrophes. It also emphasizes to protect your country from the external dangers. In this regard, it says:

وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ
يَعْلَمُهُمْۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَىْءٍ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ
لَا تُظْلَمُونَ (8: 60)

Keep ready what force you can muster to meet your enemy together with strong cavalry with which you can strike terror in the hearts of those who are enemy to Allah and to you. And to those who are in your knowledge, and those besides them whom you do not know till yet. To do so, huge expenses are involved. For this purpose, whatever you expend in the cause of Allah shall be repaid to you justly. There will be no reduction in it -not a bit even.

The State was an imaginary concept. In contrast to it, country is the name of a track of land. When we say the country is in danger, its danger can be perceived, can be seen. No body can deceive it. Nor can be deceived. The magnitude and the nature of this danger can be judged on the basis of the information one acquires. But its relation pertains to the degree of perception; it is not imaginary like that of the State.

What is End in Itself?

But in spite of laying such a strong emphasis on the safety and security of the country, the Qur'an does not judge **it to be the end in itself**. On the contrary, it calls **it a means to**

an end to be achieved. It is just like the house, which is not an end in itself; it is a means of residence to the members to the family. If there are no inhabitants in the house, it becomes desolated and barren. The house is not an end in itself; it is the inhabitants that are the end. House is the means for its inhabitants to achieve their ends. If the house is strong, it gives no benefit to itself; its inhabitants are secure and satisfied. When the house crumbles down, it gives no harm to itself; it is the inhabitants that are destroyed. To the Qur'an, **the end is neither the State, nor is the country; it is the individuals that are the end in themselves**; even the existence of the external universe is not the end. These are all for the munificence of the man. The Qur'an elaborated this concept when it said:

(2:29) هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعًا

Whatsoever is there in this sphere of earth, God has created it **for you**. Not only in the earth but also:

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعًا مِّنۡهُۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ

(45: 13) لَأٓيَٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَتَفَكَّرُونَ

Whatsoever is there in the earth and the heavenly bodies, God has all harnessed for you. In the words of Muhammad Iqbal, the renowned Muslim philosopher:

Neither you are for the earth, nor for the heavenly bodies

The entire universe is for you, and not you for it all

And further he adds:

With the warming activities of the man, is the entire tumultuous upheaval

Each and every body in the universe, the sun, the stars, is but spectators

This is the relation of man with universe. But the topic under discussion pertains to the question of **mutual relation of man with man**. It is this mutual relation which gives birth to the concepts of civilization, culture, sociology, and politics; this generates various systems, rules and regulations. I have just told you that the Qur'an has not mentioned even the name of the State; it has definitely given the idea of the country, and within this conception, it has also propounded the concept of governance. We have seen what was the defect in the theory of the State was, in fact, the defect in the system of sovereignty. The Qur'an has termed the system of sovereignty as the governance, as the management of the things. Now the question arises: **what is the Qur'anic concept of sovereignty or of the system of governance? And what is the place and status of the individuals in it?**

Qur'anic Concept of System of Governance

Whatever is the system of governance in vogue in the world, the authority of some men over the others remains established in one way or the other. The Qur'an terms this

concept as humiliating to the humanity. It does not allow some men to wield authority over the other men. It calls it against the concept of equality of human beings and terms it opposite to the respect of the manhood. It says that the governance of men over the men is false because it deprives the individual of the freedom he gets as man.

But without any system of governance, the society of human organism can not remain established. It will set forth this question: **what does the Qur'an tell the solution to this problem?** The solution it suggests is that the man or the group of men has no right of governance over the other men. The right of governance is vested with Allah alone. It immediately transfers the mind to theocracy where we are trapped in the idea of the State. In this concept, the right of governance is vested with the forces, the elements that are not related to the perceptual world. The men are ruled under the authority, which they can neither see, nor hear, nor can they say anything to it. Nor can they ask it: **"Is whatever we are told to do really your orders and is whatever we are asked to sacrifice your demand?"** This is a very reasonable question and its answer is the most reasonable one. It says that you are related with an imperceptible, invisible being (Allah) in this system but He has given a code of laws and values for His system of governance, which is concrete and visible. You can see, read, and understand it. Allah's governance means obeying this code of laws and values. This code is both perfect and unchangeable. Not to speak of others, He has said to His Messenger that:

(5: 48) فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُۖ

Judge the matters of these people according to the Book of Allah. And declare it openly that:

(10: 15) مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِ نَفۡسِيٓۖ

It is not for me to make any changes therein according to my wishes.

What a great satisfaction has the individuals of the society (nay but the entire humanity) acquired that the governance on us will only be of this Book alone! Order will only be of His to be executed. Other than Him, no body will have right to make us obey him. Even the one who makes us obey His Laws will himself first obey these Laws. From this point of view, there will neither be any ruler nor any ruled.

The End of *Nubuwwah* as Manifesto of Freedom

I have just said that the satisfaction (that no one among us will be able to exercise his authority over others, the obedience will only be to this Book, the Qur'an) was not only restricted to the men of the time of the Messenger (pbuh). It will also be equally attainable to the last breath of soul on this earth. It was because after the completion of this Book, it was promulgated that the sequence of ***Nubuwwah*** has finally ended. Now no body will be able to say up to the day of resurrection that your Allah has ordered to obey him compulsorily. Whatever Allah has to say has finally said in this Book. Now

from onward neither will Allah say any thing else, nor will there be any change, amendment, and modification in it. Gentle hearts, it was our hard luck (and I will say it was the biggest controversy against Islam) that the **End of *Nubuwwah*** was made just an issue of belief. Otherwise, up to the day of resurrection, it was a manifesto of freedom, and the message of death for every kind of slavery, for the manhood. Pause and reflect, what a great and magnificent promulgation it was that a man, a group of people, or a nation that intends to get freedom from the slavery of the men may accept this Book, and understand it! Imposed on its freedom will only be those restrictions, which have been prescribed in this Book. Now, no body will be able to say that not only him, but also Allah has imposed such and such additional restrictions on you or has made changes in these restrictions. This was the Universal Manifesto of Freedom, which the End of ***Nubuwwah*** has granted to the entire comity of human beings. In other words it was the surety that from now onward no body, nor any group of people, will be vested with the authority to get them obeyed. Nor will any body or any group of people is vested with power to impose any restrictions that are not in this Book whether that is on the name of the State or in the name of God Himself. Could there be a bigger freedom than that ever conceptualized? Or can it be imagined?

Purpose of These Restrictions

Now the question is what is the purpose of the limitations or the restrictions prescribed in the Book of Allah? The purpose of man-imposed restrictions on the other men is either to decrease or to restrain the vested authority of those on whom these restrictions are imposed. In other words it means to limit or to divest their freedom. But the Qur'an says that God-imposed limitations and restrictions do never mean to limit or to divest their freedom. It is never the achievement of that purpose. On the contrary:

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

The purpose of God-imposed restrictions is to further broaden the human personality.

Enlarging and broadening the latent potentialities of the human personality is a psychological process, the discovery of which could have been possible (that too to a limited extent) with the development of the discipline of Psychology in the present times. Prior to this development, it was least understood. The psychologists say if the energy of the human personality that is operating for destruction is diverted to constructive pursuits, it multiplies in two folds for integration process. This process, in their terminology, is called ***sublimation.*** Fourteen hundred year ago, the Qur'an has unfolded this reality. It says that the purpose of the restrictions imposed on the human personality is to broaden it by sublimation.

(2: 286) لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

By obeying the Divine Laws, the human personality is broadened. This may also mean that for the accomplishment of the task assigned, one should exert one's capacities to the full. On the ordinary level, understand this phenomenon with this example. When water

in a canal starts flowing at low ebb, a fall of the stones is built in it. The purpose is not to impede the flow of water. When water bumps against it, its flow multiplies many folds. This is the purpose of imposing restrictions by the Book of Allah.

We have seen that it was said to the Messenger of Allah (PBUH): Establish system of governance according to the Book of Allah. One of its purposes was:

(7: 157) يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَـٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ

To lift the burdens under which the humanity groans. It will make them free from the shackles, which bind them. The humanity will be made free from the chains of slavery tied so long. This purpose by itself is great. But it is only the negative aspect. After shattering these shackles, and making the humanity free from them, the Qur'an takes a positive step. For this purpose, the second aim of the Messenger of Allah (PBUH) is told as:

(62: 2) وَيُزَكِّيهِمْ

He (PBUH) manages for the development of the personality of the human beings. This responsibility was not restricted to the life of the Messenger of Allah (PBUH), it had to move further, and it was the aim of the system that was established for the practical implementation of the Book of Allah. That is why it was said to the party of the people responsible for the establishment of this system:

(22:41) ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّـٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ

These are the people who will establish System of ***Salaat*** when they have the control of the country and "will give ***Zakaat".*** I have no time to explain this aspect of the program of the Islamic system of governance that has so comprehensively been given in this brief verse. I will deliberate upon one aspect that is related to the topic under discussion i.e., the broadening of the individuality, the development of his personality. In our system ***Zakaat*** generally means "at the end of a year, giving some amount of money from one's wealth in the path of Allah". 'Giving some amount' is not the end product of the Qur'an. The Qur'anic exposition of this term is much more broad. It has been said here that the responsibility of the Islamic System is ***Eetta-e-Zakaat***, not "giving the ***Zakaat***" or "receiving the ***Zakaat***". The word ***Zakaat*** means: "to grow, to develop, to bloom and blossom". "***Eetta-e-Zakaat"*** means providing the means of development to the individuals. The development includes physical as well as personality development of the man. So far the physical development of the humans is concerned, it pertains to the Qur'an's system of economics. I have written much for the last 25 years. At this point of time I present the gist of this system through the saying of the Messenger of Allah (PBUH):

> **Where a person goes whole night hungry, God's responsibility of protecting of his community ceases.**

And this was the same responsibility that the 2nd caliph Hazrat Omar (RA) repeated in his well-known words:

> **If a dog dies of hunger by the Tigris (river in Iraq), I swear by God with Whom rests my life, Omar (RA) will be held responsible for it.**

This very aspect of "***Eetaa-e-Zakaat***" is the obligation of the Islamic System that is related to satisfying the physical needs of the individuals. So far the development of the potentialities of the human personality is concerned, I may make it very clear that this is the ultimate end of this system to be achieved. The first article of this system is to create an atmosphere wherein is the state of

(2: 38) لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

There is no fear and sorrow, no grief and anxiety, no agony and pain. In other words the individuals of the society have neither any fear of the external dangers, nor any grief and anxiety within their internal world. Dear hearts! Pause and think, what a good foundation this aspect of the system garners for the development of human potentialities!

The other obligation of this system with reference to the Messenger of Allah (PBUH) is described in these words:

(62: 2) يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

He (PBUH) makes arrangements to educate them in such a way that they may be able to understand the **'why of law'** on one hand, and garnishes their intellect to enable them to grasp the depths of the mysteries of the universe on the other hand. He (pbuh) first says تُطَهِّرُهُمْ and then تُزَكِّيهِم (9:103). He (pbuh) not only nourishes the human potentialities, but also makes them able to utilize these developed potentialities in consonance with Divine Value. It inculcates purity in character and beauty in conduct. It is called sublimation process of character and conduct.

Ultimate End

You would have seen from these illustrations that the Qur'anic view of (a) providing the Divine System of Guidance, (b) sending the Messengers (Peace Be Upon Them), (c) revealing the code of Divine Laws, (d) prescribing restrictions, and (d) keeping the final Book of God perfect, unchangeable, and protected -the logical consequence of which is the End of Messenger-hood has **an end** to achieve. This **end** is the achievement of the following objectives:

- To make the human beings free from the shackles of slavery
- To develop the potentialities of the human being
- To utilize these developed potentialities in consonance with Divine Values.

This process is denoted as purity of character. But further thinking in the Qur'an makes this reality clear that individual's growth and development is not the last stage of this

process. Its next stage is to prepare a group of people, a nation whose **end** is the well being of human species. For such a kind of nation, it has been said that:

(3: 109) كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

You are the integrated nation, equipped for the well being of the manhood. You are an ***Ummah*** raised for the good of all humanity.

Judge the importance of this fact that the Qur'an has said of the individual:

(89: 29-30) فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي

If you desire to join the paradisal life, partake the company of My men. This one order eradicated concept of mysticism. Paradisal life can not be had in the solitude sittings of the monasteries, and the closets of Dervishes and mendicants. It can only be gained in the crowd multitude of collective life. In other words, individuals are an integral part of the group of people or of ***Ummah*** and the responsibility of the group or ***Ummah*** is the welfare and wellbeing of the universal humanity. For the welfare of the humanity, the Qur'an does not use the ambiguous terms like "interest of the State", or public interest. In clear and unambiguous words, it says:

(13: 17) وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

Always remember that which is beneficial for the humanity endures; Everlastingness and permanence is only for the acts that are beneficial for the mankind.

Relation Between Individual and Party

I have presented the mutual relation between the individual and the State whatsoever I, with my own vision, have understood from the Qur'an. But we have a new terminology introduced in our times. It is Collectivism Theory. This theory is neither new, nor unique. It is, in fact, the changed name of Hegel's Theory of the State. According to this theory: interest of the State is the most important consideration. The State is the spirit that dwells in the world and realizes itself as the other of itself. It possesses an "organic" unity. Existence is only of society or party, and not of the individual. With this exposition of Collectivism Theory in view, there is no need to add any thing to what has been said of the State Theory. The Qur'an lays stress on the collective life. And the antagonists of Collectivism Theory, presenting it in support of their theory, term it exactly in accord with Islam. I thought it necessary to remove this confusion in a few words. Some of them have been heard saying that Iqbal, the great Muslim scholar, also held the same theory. It is ingeniousness of irony and severe oppression on Iqbal. Every one knows that Iqbal is a torchbearer of the philosophy of Self (I-am-ness). Self is the other name of individuality. The sum total of Iqbal's message is the development, preservation, and immortality of the individuality. He showers so much importance to the individuality of the human self that he does not allow this self to absorb in the Divine Self, what to speak of the State or the party s/he belongs to. He maintains its uniqueness. He wants to develop it so that it

may emerge as an independent entity equipped with the facets of the Divine Self. He does not accept it weakens, even at the cost of everlastingness of life. He says individuality cannot be strengthened in the solitude-sittings of mysticism; it develops and reinforces while living in the company of people. That is why he lays stress on establishing link with the party, and not being absorbed in it; ***Ummah*** other than the individuals, to him, is nothing; it generates with the mutual link with each other. When these two synchronize with each other, it is called ***Ummah***. 'Individuals of the caravan' and the 'caravan' itself is the most appropriate simile in his poetry. The caravan other than the individuals has no existence. The individuals with their mutual sync constitute it. But it is necessary that the individuals may remain with the caravan so that being in the state of protection, secure, and safe from the dangers, they may reach the ultimate destiny. The Qur'an establishes this relation when it says:

(3: 199) يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصْبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

O Jama'at-ul-Momineen, Allah's Laws have reached you. Now you be steadfast yourself and cause others also to be steadfast, stand united and adhere to Allah's Laws so that you may prosper.

This is the mutual relation of the individuals with the party. In other words it means the mutual relation of the individuals among one another is the cause of their steadfastness and reinforcement. There is no annihilation of self like the one in mysticism where it absorbs in water and ends its uniqueness. And nor is it the System of the State or the Collectivism Theory in which the State or Collectivism is the end and the individuals the means only. The life giving message of the Qur'an roots out all these theories. It has so comprehensively covered the individuality in a few words that the look of vision acclaims to be ecstatic. It says the collective life is so good and so fair but:

(6: 94) وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَٰدَىٰ

You will confront Us as individuals with your individuality and will be called to account for your thought and conduct as individuals. This is the focal point of the **Law of Requital**. The individuals try to achieve the prescribed ends of **Deen** in an organized way. This organized structure of theirs is termed as party or ***Ummah.*** Its objective is nothing but:

(9: 40) كَلِمَةُ ٱللَّهِ هِىَ ٱلْعُلْيَا

the defeat of man-made system and the triumph of Allah's system. The world has tried the various systems of life and has failed to get consolation from any one of these systems. The man is tired now and is in search of the system, he is not seeing anywhere. But this system is in the process of being in his thoughts. Erich Fromm sees its glimpse like the manner given below:

> **A society in which no man is a means towards another's ends, but always and without exception an end in himself; hence, where nobody is used, nor**

uses himself, for purposes which are not those of the unfolding of his own human powers; when man is the center, and where all economic and political activities are subordinated to the aim of his growth. A sane society is one in which qualities like greed, exploitativeness, possessiveness, narcissism, has no chance to be used for greater material gain or for the enhancement of one's personal prestige. Where acting according to one's conscience is looked upon as a fundamental and necessary quality and where opportunism and lack of principles is deemed to be asocial; where the individual is concerned with social matters so that they become personal matters, where his relation to his fellow man is not separated from his relationship in the private sphere. A sane society, furthermore, is one which permits man to operate within manageable and observable dimensions, and to be an active and responsible participant in the life of society, as well as the master of his own life. It is one which furthers human solidarity and not only permits, but stimulates, its members to relate themselves to each other lovingly; a sane society furthers the productive activity of everybody in his work, stimulates the unfolding of reason and enables man to give expression to his inner needs in collective art and rituals. (241-42)

This thinker calls this type of society as **The Sane Society**. And this is the very name of that book from which the above reference has been given. Very broadly and intensively the Qur'an describes the characteristics of this society. It covers its ultimate end in a few words when it says:

(17: 70) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ ءَادَمَ

Verily We have honoured every human being. And protecting this honour is the end product of the society. If the society or the system does not honour the prestige of the individual, it is a corrupt and cursed society. And is the root cause for deterring the accomplishment of the purpose of the creation of mankind.

The System, the State, the Society that is deprived of the individuality of the person, honour of the mankind, and allows grief-stricken life to pass has curse of Allah, of His Divine Forces, and of the Universal humanity. How alarmingly the Qur'an depicts such a life in the following verse:

(3: 87) عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ ٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ

These people are deprived of Allah's blessings as well as the support of the Divine Forces and the righteous persons. In the course of ages, this idea slowly dawned on man's mind and gradually crystallized that the world is not merely changing, but is developing towards perfection.

From the deliberations I made to you about "State Or Individual", it necessarily follows that the individual, and his personality is **an end in itself**. No man has the right to exploit another man or to use him as a means in furthering his personal interests. If society were organized on this basis, there would be neither rulers nor subjects. This is the second principle on which society in Islam is based. No man is permitted to compel others to obey him; Allah alone is to be obeyed through the Laws He revealed in the Qur'an.

****